نگارشات
خسرو، غالب، فیض
اور دوسرے مضامین
از
ڈاکٹر ظہور احمد اعوان
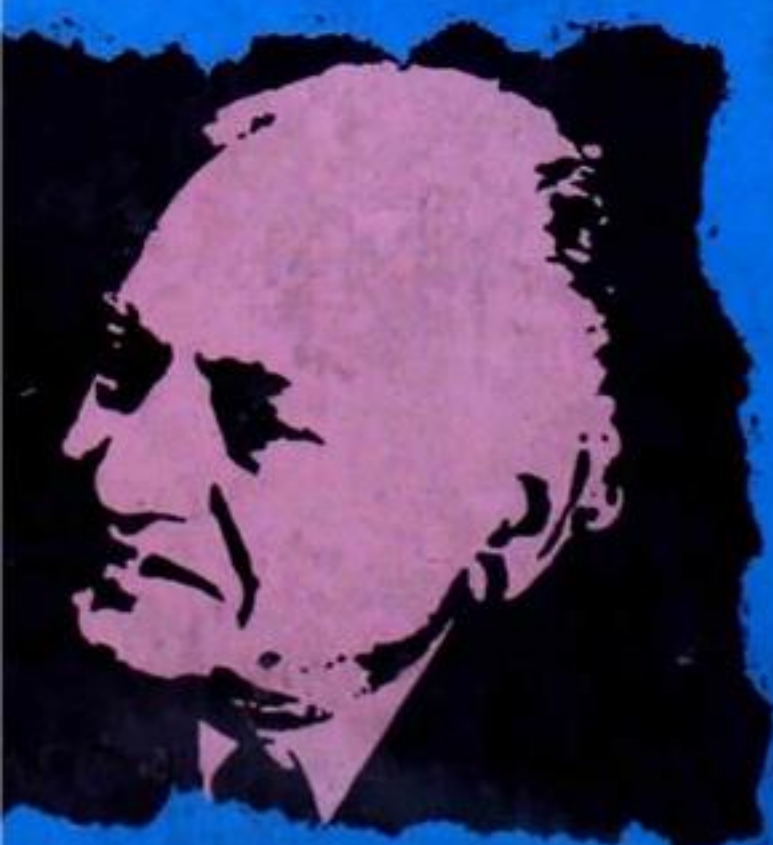
ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

دل کے غنی اور قلم کے دھنی آدمی ہیں - جو لکھتے ہیں ڈوب کر لکھتے ہیں- دل ریش ریش ہے، انگلیاں فگار ہیں مگر ذہن تازہ، توانا اور بیدار ہے ادب و علم کے ہر میدان میں موجود ہوتے ہیں- ان کی تحریر ان کی شخصیت کا آئینہ ہے- بعض اوقات لفظ موتی بن کر لو دینے لگتے ہیں- نثر کی دنیا کو بعد ایک مدت کے ایک صاحب طرز قلم کار ہاتھ آیا ہے- ان کی تحریر دل اور دماغ دونوں کے لئے فرحت کا سامان ہے-

پروفیسر شمشیر علی خان

خسرو، غالب، فیض اور دوسرے مضامین

از

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

لاہور - راولپنڈی - ملتان - کراچی - سکھر - پشاور - کوئٹہ

انتساب

فرحت کے نام جسے

بہت دکھ دیئے

فہرست

اپنی بات

ادبی مضامین کا یہ مجموعہ میری ان تحریروں پر مشتمل ہے جو میں نے گزشتہ بیس پچیس سالوں کے دوران لکھی اور مختلف اخبارات و رسائل میں چھپی ہیں۔ دوستوں کے اصرار پر ان تحریروں کو ایک جلد میں بندھوانے کی حرکت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادیبوں اور سکالروں کے نہیں تو طلبا کے کام تو آجائیں گی۔ یہ کیا دھرا میرے دوستوں کا ہے اس لئے داد بے داد دونوں کے وہی حقدار ہیں۔

میں ادب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں وہ بھی نالائق قسم کا۔ وجہ یہ ہے کہ ادب کے علاوہ سیاسیات، بین الاقوامی امور، صحافت اور دوسرے کئی میدانوں میں بھی منہ مارتا رہتا ہوں اس لئے کسی ایک فیلڈ کا نہ ہو سکا۔ زندگی کو مختصر اور کام کو لاطائل سمجھتا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہ ملتی ہے نہ ملی ہے۔ اپنے لکھے کو دوبارہ پڑھنا زہر لگتا ہے اس لئے دوسروں سے پڑھوانے کے لئے کتاب بازی کا یہ شغل اختیار کیا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ یہ مضامین جلدی میں لکھے گئے ہیں۔ ان پر نظر ثانی نہیں ہوئی ان کی کمیوں کجیوں کو دور نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ پروف ریڈنگ بھی دوسروں سے کروائی گئی ہے۔ اسمیں ہزار خامیاں آپ کو ملیں گی جو میری اپنی ہیں۔ اگر کوئی خوبی نظر آجائے تو اسے اپنی سمجھئے۔ یہ تو بھلا ہو نیشنل بک فاؤنڈیشن اور ان کے فعال و جاندار ڈائریکٹر جناب نذیر یوسف زئی کا کہ جن کی سعی سے یہ کتاب اتنے خوبصورت انداز میں آپ کے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔ میرا بس چلتا تو اپنی دوسری کتابوں کی طرح اسکا حلیہ بھی بگاڑ کر رکھ دیتا۔ مگر یوسف زئی صاحب نے اپنا خانۂ کتاب مزید خراب کرنے سے ہمیں روک دیا۔

میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے اس ادنیٰ سی ادبی کاوش کو پزیرائی بخشی اور اس دور میں جب علمی و ادبی کتاب مزدوری اور معاوضے پر پڑھوانے کی نوبت آگئی ہے ایک ادبی کتاب چھاپ کر اپنا بھلا کیا ہو یا نہیں ایک لکھنے والے کی مشکلات کو ضرور کم کیا ہے۔ خدا اس کتاب کے پڑھنے والوں کو معاف کرے اور نہ پڑھنے والوں کو خوش رکھے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

پیش لفظ

پروفیسر:۔ سید اشرف بخاری

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا تعلق یوں تو ادبیات سرحد کے نسبتاً "تازہ واردان میں ہے گو یہ تعلق اتنا تازہ بھی نہیں لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے مختصر عرصہ ہی میں اپنے لئے قابل رشک مقام پیدا کر لیا ہے۔ اب تک سرحد میں ادیبوں کی پہچان شاعری کی حوالے سے رہی ہے کہ یہاں نثر کے مقابلے میں شعرو شاعری کا چرچہ زیادہ ہی رہا۔ وجوہ خواہ کچھ ہوں دو چار مستنسیات کو چھوڑ کر نثر یہاں کے لکھنے والوں کا بہت کم حوالہ بنی۔ اعوان صاحب اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ نثر ان کی معرفی کا وسیلہ ہے۔

ڈاکٹر اعوان صاحب غضب کے لکھاڑی ہیں۔ تحریر و تسوید کے میدان میں ان کی آمد خاصی دھماکہ خیز رہی۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت کے آگے متعدد و متفرق موضوعات دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ تعلیم و تعلم' تنقید و تحقیق' اقبالیات' تراجم' اخباری کالم' خاکہ نگاری' سفرنامہ' تاریخ و تہذیب' غرض کوئی بھی موضوع ان کا حدف بننے سے محفوظ نہیں رہا۔ ناوک نے تیرے -------
ایک مختصر عرصے میں سے انہوں نے اتنا کچھ لکھ ڈالا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ سچ پوچھئے تو ان کا قلم جس مستعدی سے فراٹے بھر رہا ہے اور جس تیزی سے وہ لکھ رہے ہیں اس تیزی سے تو بی بی سی والے خبریں نشر نہیں کرپاتے۔ یقین مانئے ان کی اس زود نویسی بلکہ تیز نویسی کا یہ عالم دیکھ کر دھڑ کا لگ جاتا ہے کہ "کہیں نظر نہ لگے اس کے دست و بازو کو"

یوں تو ڈاکٹر صاحب ڈھیر ساری کتابوں کے مئولف و مصنف ہیں۔ لیکن ہماری نظر سے ان کی جو مطبوعہ تخلیق کاوشیں گزری ہیں۔ ان میں "سب دوست ہمارے" "دیکھ کبیرا رویا" "کشمیر انتفادہ" اور "دو اقبال" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کا بہت سا قابل اعتنا تحریری سرمایہ اب تک طبع نہیں ہو سکا۔ اگر یہ مسودہ اشاعت کے مراحل سے گزر گئے تو انشاء اللہ ان کا پایہ عمل و تحقیق ارباب دانش کے لئے وجہ مسرت ہو گا۔

"دیکھ کبیرا رویا" ڈاکٹر صاحب کے سفر امریکہ کی روداد جاں جانواز ہے۔ اطلاعاً "عرض ہے کہ بھلے دنوں میں "فرنگ رہ گزر سیل بے پناہ میں تھا" آج کی اردو دنیا کا المیہ یہ ہے کہ وہ بھانت بھانت کے سفرناموں کی یورش بے پناہ کی زد میں ہے۔ یہ سفرنامے کیوں لکھے گئے کیسے لکھے گئے۔

ان کے پیچھے کس کس کی سازش کارفرما ہے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ سب سوالات محققین کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں اور اس کا اعلان بہانگ دہل کرتے ہیں کہ اپنا سفرنامہ ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کو "بچشم خود" دیکھ کر لکھا ہے کہ وہ تین سال فل الواقع اپنے مادی وجود کے ساتھ امریکہ میں گھومتے پھرے۔ اس اعلان حق کا واحد سبب قارئین پر واضح کرنا ہے کہ آج اردو سفرناموں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو دیکھ کر گمان بلکہ یقین ہونے لگتا ہے کہ اب سفر نامہ لکھنے کے لئے سفر کی ضرورت نہیں رہی۔ اور اب "سفر ہے شرط-----" والا تکلف برتنا عقل و احتیاط سے نسبت نہیں رکھتا۔

"دیکھ کبیرا رویا" ڈاکٹر صاحب کی "کھلی ڈھلی" شخصیت کا عین مین ایک نقشہ جمیل ہے۔ پورا سفرنامہ ان کی شخصیت کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن یہ روزشپ کی خشک ڈائری اور روزانہ کی مصروفیات کا بے جان کیلنڈر نہیں۔ آپ بیتی، جگ بیتی اور احوال و وقائع کا پرکشش مرقع ہے۔ ایک بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ امریکہ ہم بھی گئے دو ڈھائی سال قیام بھی کیا۔ لیکن یہ سفرنامہ پڑھ کر احساس ہوا کہ انکل سام کا اصل رنگ و روپ دیکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی "چشم بینا" کا ہونا ضروری ہے۔ وہی انکل سام جو سفرنامے کے لئے صفحات پر پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ (غالب سے معذرت کے بعد)

ے "میں وہ کہ ہر لباس میں ننگ وجود (ننگے وجود) ہوں"

"سب دوست ہمارے" ڈاکٹر صاحب کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف شعبہ ہائے حیات کے جانے پہچانے لوگوں کو دلچسپ انداز میں متعارف کرایا ہے۔ جن لوگوں کے خاکے لکھے گئے ان میں اکثر تاہنوز زندہ ہیں۔ زندوں کے بارے میں لکھنا پل صراط کو طے کرنا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ مرحلہ اپنے طبعی اعتدال و توازن کے سہارے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے طے کئے ہیں۔ انہوں نے خاکہ ضرور لکھا لیکن نہ خاک اڑائی، نہ خاکہ اڑایا۔ ان کے خاکے استہزا کا نہیں ہمدردی کا انداز رکھتے ہیں۔ بعض معاصر شخصیتوں کے بارے میں انہوں نے قلم کی باگ بڑے زور سے کھینچے رکھی اور یوں کچھ (پردہ نشینوں) کو سرعام رسوائی سے بچانے کے لئے خاصا اہتمام کیا۔ یہ ان کی طبعی مروت اور مستحسن مشرقیت کی دلیل ہے۔

"کشمیر انتفادہ" انگریزی میں مسئلہ کشمیر مالہو وما علیہ پر ڈاکٹر صاحب کی قابل تحسین تحقیق

کاوش ہے۔ مسئلہ کشمیر کی معروضی افہام و تفہیم اور جہاد کشمیر کی موجودہ انقلابی صورت حال کو سمجھنے میں یہ مقالہ خاصہ کار آمد ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسے ماخذو مصادر سے کام لیا گیا ہے جن تک رسائی ہر صاحب قلم کے بس کا روگ نہیں۔

"اقبال و افغانستان" ڈاکٹر صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ پشاور یونیورسٹی کے سنٹرل ایشین سٹڈی سنٹر کے زیر نگرانی لکھا گیا۔ جو اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ امید ہے اقبال شناس اس سعی بلیغ کا خیر مقدم کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی تازہ تصنیف خسرو، غالب فیض اور دوسرے مضامین ان کے سولہ سترادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے گزشتہ بیس پچیس سالوں میں لکھے اور مختلف علم و ادبی رسائل میں چھپوائے۔ ڈاکٹر صاحب اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں جسمیں علمیت کے ساتھ ادبیت کی چاشنی مل کر ادبی حسن پیدا کر دیتی ہے۔ ایک چوتھائی صدی کے دوران لکھے گئے ان مضامین میں ان کے اسلوب کا اتار چڑھاؤ بھی بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تحریریں ادب کے قارئین اور طلبا کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

آخر میں اتنا ضروری عرض کروں گا کہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جس تیزی سے علم و تحقیق کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بڑے وثوق سے ان کے تابناک علمی و تحقیقی مستقبل کی پیشن گوئی کی جاسکتی ہے۔

امیر خسرو۔ طوطئ ہند

دانی کہ ہستم در جہاں من خسرو شیریں زبان
گر نائی از بہر دلم بہر زبان من بیا

خسرو جیسی نابغہ روزگار اور جامع الاکمال شخصیت کی زندگی اور کارناموں کا احاطہ اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں ہے تاریخ کے بعض خوش بخت لمحوں میں ایسے تخلیق کار جنم لیتے ہیں جو شعرو سخن کے آسمان پر ہمیشہ کے لئے جگمگاتے رہتے ہیں۔ خسرو ایک عہد ساز فن کار تھے جنھوں نے نغمہ و شعراور سازو سخن کی نئی دنیائیں آباد کیں۔ خسرو کی ہمہ جہت اور ہمہ دان شخصیت نے تاریخ کے نئے باب رقم کئے ان کے وجود نے جہاں شاہی درباروں میں بار پایا وہاں صوفیا کی خانقاہوں اور درگاہوں میں بھی مقام حاصل کیا۔ خسرو کی زندگی ہمہ قسم حادثات و واقعات سے معمور ہے۔ جس میں شاہی "تخت" محلاتی سازشیں، خونچکاں حادثات، صوفیانہ کمالات، جاگیردارانہ نظام ہندو مسلم تہذیب و تمدن غرض ہر قسم کے اتار چڑھاؤ کی تصویر موجود ہے۔

خسرو بے بدل شاعر، ہفت زبان عالم ماہر موسیقی، سپاہی، درباری صوفی اور

مورخ تھے وہ شاعری میں طوطئ ہند کے نام سے پہنچائے جاتے ہیں۔

چو من طوطئ ہندی راست پرسی
زمن ہندوی پرس تاراست گویم

شعر و ادب کی تاریخ میں بہت کم ہم ایسی شخصیات ملتی ہیں جو اپنے اندر اتنی متنوع صلاحیتیں رکھتی ہوں۔ خسروؔ صحیح معنوں میں ایک نابغہ تھے اور یہ کہنا کچھ زیادہ غلط نہیں کہ اب تک ہندوستان نے صرف دو ہی جینئس پیدا کئے ہیں۔ ایک امیر خسروؔ اور دوسرے غالب۔ نابغہ کی تعریف ماہرین فن یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ عام لوگ نہ کر سکیں اس کو سرانجام دینے والا فن کار کہلاتا ہے اور جو فن کار بھی نہ کر سکیں اس کو سرانجام دینے والا نابغہ کہلاتا ہے۔ جہاں تمام فن کاروں کی صلاحیتیں، اسالیب اور رسائی ختم ہو۔ وہاں سے نابغہ کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ نابغہ نہ صرف پرانی اصناف میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ بلکہ وہ نئی اصناف اور نئے اسالیب کا خالق اور پیش کار بھی ہوتا ہے اور خسروؔ یقیناً" کئی جدتوں کا امام تھا۔ خسرو کے کلام میں جو آفاقیت پائی جاتی ہے وہ اس کے کلام کو کائناتی حسن بخشتی ہے۔ خسروؔ کے کلام میں فنی پاکیزگی چابکدستی، جاذبیت، مٹھاس، رعنائی اور لازوال حسن ہے۔ اس کی تازگی قائم ہے اور رہے گی۔

اس کی بسیار گوئی حسن و فن سے معرا نہیں۔ فنی مٹھاس کے ساتھ اس میں درمندی اور گداز بھی موجود ہے اور یہ خوبیاں اس کو ان بلندیوں پر لے جاتی

ہے۔ جہاں بہت کم فن کار پہنچ پائے ہیں۔ اس کا فن صدیوں کے آئینے میں جاگتا، نکھرتا اور بولتا ہوا نظر آتا ہے۔

خسرو کا فن ہمارے اجتماعی فنکارانہ شعور کا ایک حصہ رہا ہے جس کا اظہار زبان و بیان اور فن و فکر کے مختلف اسالیب میں ہوتا آیا ہے۔ خسرو کا فن صدیوں سے پروان چڑھتے ہندو مسلم کلچر کی تصویر اور از منۂ وسطیٰ کے انسان دوستانہ رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ خسرو تاریخ کے اس لمحے پر ظاہر ہوتا ہے۔ جب اسلامی اقتدار اپنے ارتقاء کے دوسرے مرحلے سے گذر رہا تھا۔ پہلا مرحلہ منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر ختم ہوا۔ سقوط بغداد کے بعد اقتدار، علم، وقار کی علامتیں برصغیر میں ظاہر ہونے لگیں۔ اسلامی عظمت و قار کا ارتکاز ہندوستان میں ہونے لگا۔ پرانی سلطنتوں کے صاحبان فن و کمال آہستہ آہستہ برصغیر کا رخ کرنے لگے۔ ہندی فن و فکر، مسلم اقتدار اور ثقافت، شعر و سخن، عربی، فارسی علوم اور دوسرے عوامل و عناصر کے ارتباط سے ایک نئی تصویر ہندوستان ابھرنے لگی۔ خسرو اس ملاپ کا عکاس ہے۔ تاریخ کے اس مرحلے پر ایک دیو قامت فن کار کا ظہور ہوتا ہے۔ جو اپنی ذات کے اندر ان تمام سماجی، ثقافتی فکری، عمرانی، تاریخی، جغرافیائی اثرات کو مجتمع کر کے ایک ثقافت وحدت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ عمل ایک سماجی ضرورت ہوتا ہے خسرو تاریخ کا یہ کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح کا رول اسلامی نشاۃ ثانیہ کے تیسرے مرحلے پر اقبال مغربی فکر و فن اور مشرقی علوم و مذہبیات کو یکجا کر کے ادا کرتا

ہے۔ خسرو ایران میں سعدی اور یورپ دانتے کا ہمعصر تھا۔ یہ سب فن کار انسانی زندگی کے شعور اور مقصد کی تلاش میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ خسرو بھی فرد کو شکست سے بچانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور مختلف النوع کرچیوں کو یکجا کر کے شخصیت کی تعمیر پر زور دیتا ہے۔

خسرو کے آباؤ اجداد ماور النہر کے رہنے والے تھے۔ منگولیائی انقلاب کے بعد التمش کے دور میں یہ لوگ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ خسرو کا والد امیر سیف الدین محمود لاچین قبیلے کا سردار تھا۔ وہ اپنی شجاعت کی وجہ سے کئی ترک سلاطین کے ساتھ وابستہ رہا اس کی شادی ایک مقامی رئیس عماد الملک کی بیٹی سے ہوئی۔ خسرو ترک باپ اور ہندوستانی ماں کی اولاد تھا۔ اس کی پیدائش 1253ء میں ہوئی۔ اس کا باپ خسرو کو 8 سال کی عمر میں یتیم کر کے فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی پرورش اس کے نانا عماد الملک کے ہاتھوں ہوئی۔ عماد بہت بار سوخ آدمی تھا۔ وہ اپنے دور کا ایک کامیاب سیاست دان اور بادشاہ گر ٹائپ آدمی تھا۔ جو چالیس سال تک مختلف سلاطین کے درباروں کے ساتھ بطور وزیر منسلک رہا۔ چنانچہ نانا نے نواسے کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ درباری رکھ رکھاؤ' سیاسی ہنر مندی' محلاتی آداب' اور دوسرے تمام مروجہ فنون حرب و ضرب خسرو نے نانا کی رہنمائی میں حاصل کیے۔ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو عملی تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی حاصل ہوا۔

خسرو کی شاعری ان کی زندگی کی داستان بھی ہے۔ وہ ہر قسم کے واقعات'

تجربات، احساسات کو شعر کے قالب میں ڈھانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ خسرو جیسا ماہر فن شاعر نہ پہلے پیدا ہوا تھا اور نہ پیدا ہونے کا امکان ہے۔ قیامت کے دن تک خسرو جیسا جامع کمالات شخص دوسرا نہیں ہو گا۔ خسرو اپنے ماحول، گرد و پیش، ذاتی زندگی، معاشرتی زندگی سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ان کی شاعری کے ذریعے تاریخ کے سفر کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ خسرو نے تاریخ کے کئی انقلابات کا مشاہدہ خود کیا تھا۔ بادشاہتوں کا بننا ٹوٹنا، خاندانوں کا ابھرنا، مٹنا۔ اس نے خاندان غلاماں خاندان خلجی اور خاندان تغلق کے آٹھ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ان کے ساتھ براہ راست وابستہ رہا۔ سلطان محمد بلبن کے قتل کے بعد اسیری کے ایام کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

من کہ بر سر نمے نہادم گل
تو برہ بر نہاد و گفتہ جل

قید سے رہائی کے بعد اس نے ایک دلدوز مرثیہ اس شہادت کے بارے میں لکھا جو بلبن کو جا کر سنایا۔

واقعہ ہست ازیں یا بلا از آسماں آمد پدید
آفت است یا قیامت در جہاں آمد پدید

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی وفات پر لکھا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چو دیس

وہ شاعر ہفت زبان تھا۔ ہندی، عربی، فارسی، پنجابی، ترکی اور دوسری کئی زبانوں میں اس نے شعر کہے۔ وہ تاریخ کے اس لسانی عمل کا شعور رکھتا تھا۔ جس میں ایک نئی ہندوستانی زبان وجود پذیری کے مراحل سے گذر رہی تھی۔ خسرو نے سب سے پہلے اس ریختہ یعنی زیر تشکیل زبان کو شاعری میں پیش کیا۔ اسی بناء پر ایک زمانے میں اس کو اردو کا پہلا شاعر مانا جاتا تھا۔ مقامی بولیوں کے ساتھ عربی، فارسی کے ملاپ سے خسرو نے بڑی خوبصورت جدتیں پیدا کیں۔ اگرچہ ان سے منسوب اس طرح کا اکثر کلام ان کا نہیں بلکہ بعد کی پیداوار ہے۔ مگر پھر بھی یہ تاریخی حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اس نے زبانوں کے میل ملاپ کے نمونے پیش کئے۔ اس کی جدت طرازی خوب جوبن پر دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دوہے گیت سب لکھے۔ مندرجہ ذیل کلام بھی ان سے منسوب ہیں۔

سنبوسہ کیوں نہ کھایا جوتا کیوں نہ پہنا تلا نہ تھا
گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا گلا نہ تھا

ایک دفعہ ایک کنوئیں پر چند لڑکیوں سے پانی مانگا۔ لڑکیوں نے شعر کی فرمائش کی۔ جس میں کچھ چرخہ، ڈھول کا ذکر ہو۔ امیر خسرو نے کہا:۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آتا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اس طرح ترکی ہندی تعلیم و تربیت کا اجتماع خسرو کی ذات میں ہوا۔ جب خسرو کی عمر بیس سال کی ہوئی تو نانا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد خسرو نے درسگاہ سے زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھا ہے۔ پہلے پہل وہ بلبن کے بیٹے بغرا خان کے مصاحبت میں آیا' جو اس وقت بنگال کا گورنر تھا۔ بعد ازاں وہ بلبن کے دوسرے بیٹے سلطان محمد شہید کی ملازمت میں آگیا اور ملتان میں سلطان شہید کے ساتھ 5 سال قیام کیا۔ منگولوں کے ساتھ لڑائی میں سلطان محمد مارا گیا اور خسرو قید ہو گیا۔ جنگی قیدی کی حیثیت خسرو کو کڑے مصائب جھیلنے پڑے اور جسمانی مشقت بھی کرنا پڑی۔ خسرو کے فرار کی کہانی' بڑی دلچسپ ہے۔ سپاہی خسرو کشاں کشاں لے جا رہے تھے۔ گرمیوں کے دن' سخت دھوپ اور دوپہر کا وقت' پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ راستے میں ایک ندی آئی۔ سپاہی پانی پر پل پڑے' مگر خسرو کے قدم روک لئے۔ سپاہی پانی پی پی کر بے حال ہو گئے اور کئی تو بالکل ہی لیٹ گئے خسرو نے صرف ہونٹ تر کئے اور وہاں سے کھسک آئے۔ وہاں سے آنے کے بعد وہ پھر بغرا خان کے دربار میں آگئے۔ بلبن کی وفات کے بعد بغرا خان کا بیٹا کیقباد اپنے باپ کا حق مار کر بادشا بن بیٹھا۔ خسرو اودھ چلا گیا۔ کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی نے خلجی خاندان کی حکومت قائم کی۔ اس علم دوست بادشاہ کے دور میں خسرو کو عزت و احترام نصیب ہوا۔ اس کے بعد علاؤ الدین خلجی' قطب الدین مبارک شاہ اور خاندان تغلق کے دور میں خسرو کی شاعرانہ و فنکارانہ عظمت کا اعتراف کیا جاتا

رہا۔ اسے بھرپور دنیاوی شہرت ملی۔ مبارک شاہ نے ایک ہاتھی کے برابر سونا تول کر خسرو کو دیا۔ خسرو کو حضرت نظام الدین اولیاء سے والہانہ عقیدت تھی اور خود حضرت کو بھی خسرو سے بڑی محبت تھی اور خواجہ کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد خسرو کرب کی حالت میں 1325ء میں اپنے خالق سے جا ملے۔

شاعری

خسرو کو بجا طور پر طوطی ہند کہا جاتا ہے۔ شاعری میں ان کی رومی، فردوسی، انوری، خاقانی، سعدی، حافظ نظامی، ثنائی اور ظہیر فاریابی کے پائے کا شاعر مانا جاتا ہے۔ اہل فارس بہت کم ہی کسی غیر ایرانی شاعر کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر خسرو وہ خوش نصیب شاعر ہیں۔ جن کی عظمت کو اہل فارس نے دلی طور پر تسلیم کیا ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

غالب نے ایک خط میں لکھا کہ ہندوستان نے ابھی تک ایسا شاعر و فنکار نہیں پیدا کیا ہے جو خسرو کا ثانی ہو۔ علامہ شبلی نے خسرو کو جامع فنکار قرار دے دیا جسے تمام اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ سعدی و حافظ غزل کے باشادہ تھے۔ انوری و خاقانی قصیدہ کی لنکا کے بادگن گزے تھے۔ فردوسی، رومی، جامی مثنوی کے امام تھے۔ مگر خسرو ہر فن مولا تھے۔ جس وقت اس نے شعر کی دنیا میں قدم رکھا، اس وقت فارسی شاعری مختلف اصناف میں معرکے سر کر چکی تھی۔ خسرو

نے ان تمام آئمہ فن کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنا تھا۔ خسرو نے اپنے تیسرے دیوان میں فن شعر کے بارے میں بڑی عمدہ بحث کی ہے جو از منئ وسطیٰ کے شعر و سخن پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ اس نے شاعروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی استاد نیم استاد اور نام نہاد استاد' استاد نئ' اضاف و اسالیب کا خالق اور معائب سے مبرا ہوتا ہے مثلاً" انوری خاقانی وغیرہ۔ نیم استاد محنت' ذہانت' صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے لئے مقام بناتا ہے۔ تیسرے طبقے کے نام نہاد و شعرا محض جگالی کرنے اور چباتے ہوئے نوالوں کو چبانا ہی شاعری سمجھتے ہیں۔ خسرو انتہائے انکسار سے اپنے آپ کو نیم استاد کہتے ہیں۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کے استاد تھے۔' بے داغ فن کار' چا بکدست ماہر' جدتوں کے ماہر' جدتوں سے معمور' اس کی شاعر اہل دل کو متصوفانہ خانہ بے خودی اور سرخوشی سے سرشار کر دیتی ہے۔ اس کا اسلوب جاندار قوم' رسیلا اور سجیلا تھا۔ اس کا ذہن اختراعات کی آماجگاہ تھا۔ خسروِ کہتا ہے کہ جتنا میں اپنے لبوں کو سیتا ہوں۔ اتنا شعروں کے موتی چھلک کے امڈتے اور نکلتے ہیں۔ فکر اس طرح چمکتا ہے کہ تخیل کی آنکھ اس چکا چوند کو گرفتار نہیں کر سکتی۔

وہ شاعری کو نعمت خداوندی سمجھتے ہیں' اور فلسفے سے بلند خیال کرتے ہیں۔ معلم و دانشور تبلیغ کرتا ہے۔ مگر شاعر جنجھوڑتا اور متحرک کرتا ہے۔ خسرو کی شاعری میں وجدانی مغالیت پائی جاتی ہے جو جسم روح میں برقی رو دوڑا دیتی ہے۔

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود شب جائے کہ من بودم

سعدی کی سادگی' بے ساختگی' سکون' معصومیت مروت' حلاوت وہ اپناتا ہے۔ اپنی سادہ پرکار شاعری کے ذریعے اس نے جذبوں کو سچی زبان عطا کی ہے۔ انسانی تجربات و احساسات کی الجھنیں' نفسیات کی گھتیاں' اور وقت و زمانے کی بے رحم سچائیاں اس دور کے مخصوص اسالیب کے مطابق اس نے اپنی شاعری میں پیش کرنے کی سعی کی۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں کے اتار چڑھاؤ' دکھ کرب اور کیف و سرور کے مختلف زوایئے سب ان کے ہاں ملتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی تہہ نرم و شریفانہ مزاح کی بھی جاری و ساری ہے۔ نہ ہی ان کا غم بے حوصلہ قنوطیت کی راہ دکھاتا ہے۔ اور نہ خوشیاں اپنے مقام سے گرا کر ذلتوں کی طرف سے لے جاتی ہیں۔ بلکہ ایک توازن و حسن موجود رہتا ہے۔ بعض ایرانی ناقدین خسرو کے ہاں ہندوستانیت یا سبق ہندی کا وفور پاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خسرو حتی الوسیع سبق ہندی سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سبق ہندی کے دور ازکار تشبیہات' استعارات و تخیلات ان کے ہاں کم ہیں۔ اور خوبیاں زیادہ سے زیادہ ہیں۔ انہوں نے ہندی موسیقیت' آہنگ' نغمگی کو فارسی آہنگ سے ملایا۔ اس کی شاعری' ہندوستانی لوک شاعری کا درجہ اختیار کر گئی۔ ان کی شاعری کی عظمت مترنم گیتوں میں ہے۔ جس میں ان کی بھرپور موسیقارانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے۔ منفرد موسیقی سے معمور جو شاعری ان

کے ہاں ملتی ہے وہ شاید ہی کسی اور فنکار کے ہاں اس قدرت کے ساتھ موجود ہو۔

وہ کئی زبانوں کے الفاظ کو ملا کر دلچسپ ادبی چٹکلے اور کھیل ایجاد کر لیا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں ایسی ذوالسانین مثالیں بہت میں ہیں اسی طرح قلب السانین اور ذو روئن کے ذریعے لفظوں کو کم و بیش کر کے نئے انداز پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی طرح الفاظ کے الٹ پھیر کے ذریعے ایک ہی شعر میں کئی طرح کئی معانی پیدا کر لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خسرو کی خلاقانہ جدت طرازی' بے بہا موسیقیت' عالمانہ مئورخیت' متصوفانہ جذبہ وگریز' بے مہابازیر کی' شس جہت تخیل' وجدانی دل افروزی' ما بعد اطبعاتی حسن کے ساتھ بے ساختہ اسلوب صاف ستھرے انداز فنکارانہ شستگی نے مل کر ایک لازوال فن کی تخلیق کی ہے۔ شہنشاہ سے خانقاہ تک ہر منزل و مقام پر خسرو سرخرو ہوا۔ شہنشاہ اس کو سونے میں تولتے تھے تو صوفیا دل میں بٹھاتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء خسرو کو اپنی زندگی کا حاصل قرار دیتے تھے۔

خواجہ نظام الدین اولیاء سے خسرو کا تعلق بہت گہرا اور پرانا تھا۔ خواجہ خسرو کے نانا کے بھی مرشد تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں خسرو خواجہ کو اپنے شعر سنایا کرتے تھے۔ 20 سال کی عمر میں انہوں نے باقاعدہ خواجہ کے حضور بیعت کی۔ پھر عبادت ریاضت کا دور شروع ہوا۔ راتوں کو عبادت مستقل روزہ' ہمہ وقت تلاوت' تنہائی اور چلے زندگی کا وطیرہ بن گئے۔ اپنا بیشتر وقت وہ خواجہ کے

حضور گذارہ کرتے۔ وہیں سو بھی جاتے۔ خواجہ اکثر کہا کرتے کہ میں خسرِو کی موجودگی میں کبھی بے زاری کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کا یہ بھی کہنا کہ روز قیامت جب خدا ان سے پوچھے گا کہ تو نے کیا حاصل کیا۔ تو میں خسرِو کی شاعری پیش کروں گا۔ خواجہ نے ان الفاظ میں خسرِو کی عزت افزائی کی ہے۔

سوزسینہ' ایں ترک آور وہ ام

الٰہی مراسوز سینہ ایں ترک بہ بخش

خواجہ خسرِو کو شاعری کے معاملات میں بھی ہدایت دیتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول " خسرو بطر زصفاہانیاں بگو خسرِو نے پلے سے باندھ لیا۔ اور عظیم عجمی روایات کی حامل شاعری پیش کی۔ خواجہ کو خسرِو سے یہاں تک محبت تھی کہ انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ اگر یہ بات غیر اسلامی نہ ہوتی تو وہ یہ وصیت کرتے کہ خسرِو کو ان کی قبر میں ہی دفنایا جائے ۔ خسرِو بھی اس محبت سے واقف تھے اور اپنا سب کچھ خواجہ پر نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک بھکاری کے پاس خواجہ کا پرانا جوتا دیکھا۔ بھکاری نے اس کی قیمت دو لاکھ روپے بتائی۔ خسرِو نے اتنی رقم دے کر جوتا خرید لیا۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ خسرِو نے ایک نظم خواجہ کی شان میں پڑھی جسے سن کو خواجہ نے کہا مانگو کیا مانگتے ہو سب ملے گا۔ خسرِو نے کہا کہ حضور بس دعا کریں۔ خواجہ نے کہا کہ جاؤ تکیے کے نیچے سے شکر لے لو۔ اور تمہارا کلام قند کا نمونہ بن جائے گا۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ خسرِو کو شیریں سخن اور شیریں مقال کے طور پر اب

دنیا جانتی ہے یہ سب مرشد کا فیض ہے۔ ایک مرتبہ خسرو خواجہ کے ساتھ دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ جہاں ہندو اشنان کر رہے تھے۔ خواجہ نے کہا۔

ہر قوم راست راہے دینے د قبلہ گاہے

خسرو نے فی البدیہ مصرعہ جوڑ دیا۔

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

اس وقت خواجہ ٹوپی ترچھی پہنے ہوئے تھے' خواجہ کے ساتھ مثالی محبت کا و عقیدت کا اظہار اسوقت سامنے آتا ہے۔ جب خواجہ فوت ہوئے۔ اس وقت خسرو بنگال میں تھے۔ خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ آنکھیں کھولتے ہی اس مصرعے کا ورد شروع کر دیا۔

آفتاب در زمین و خسرو زندہ ۔

خسرو بری حالت میں دہلی پہنچے۔ مزار کے مجاور بن گئے۔ اور آنسوؤں کی جھڑی میں حزینہ شعر کہتے رہے۔ اور سب کچھ خیرات میں بانٹ کر اسی حالت میں 5 ماہ بعد مر گئے اور وہیں مرشد کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

موسیقی

دوسرے تخلیقی میدانوں میں بھی ان کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ مگر موسیقی کی دنیا میں ان کے کارنامے رہتی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ اس دنیا کا تو خسرو و تاجدار تھا۔ جدید کلاسیکی موسیقی کا وہ باوا آدم تھا جس کے خمیر میں

موسیقی بطور مذہبی عبادت رچی بسی تھی۔ اسلام میں موسیقی کی ایسی روایتیں موجود نہ تھیں۔ چنانچہ اسی سماجی نفسیاتی و مذہبی ضروریات کو موسیقی کی دنیا میں پورا کرنے کے لئے ایک جینس کی ضرورت تھی۔ جو نو مسلم ملت اسلامیہ کی اس ذہنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسلامی میوزک میں انقلاب کی روح پھونکے۔ خسرو نے تن تنہا یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس نے ہندی موسیقی کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اس نے موسیقی میں مجتہدانہ اقدامات کرتے ہوئے فارسی' ترکی اور مقامی ہندی موسیقی کو نیم مذہبی انداز میں وحدت بخشی۔ موسیقی کی دنیا میں فن کے چار درجے ہوتے ہیں یعنی گنی 'گندھرب' گائیک اور نائیک' خسرو نائیک کے اعلیٰ قربن مقام پر فائز تھا۔ یہ وہ مقام ہے جس تک بہت کم فن کار پہنچ سکے ہیں۔ اس کے میوزک میں فن کے ساتھ گہرائی عقیدت اور تقدیس پائی جاتی ہے۔ اس نے موسیقی کو ان خطوط پر ترقی دی کہ بعد میں آنے والے تمام موسیقار ان کے مرہون منت ہیں۔ اس نے اپنی ایجادات 'اختراعات کے ذریع دنیائے موسیقی میں انقلاب برپا کیا۔ انہوں نے راگ راگنیاں بھی ایجاد کیں' جن میں ایمن بہت مقبول ہوا۔ اس کی دوسری اختراعات میں مندرجہ ذیل اہم ہیں۔

آلاپ' دھرپد' خیال ترانہ' سرگم' قول' تعمیری' زیلف' سرپردہ فردوست وغیرہ۔

ترانہ اب دنیا کے کونے کونے تک پہنچ چکا ہے خسرو نے مقبول عام صنف

قوالی بھی رائج کی۔ قوالی ایک بہتر مسلم متبادل تھا۔ اس مذہبی ضرورت کا جس کی پیاس نو مسلم رعایا محسوس کرتی تھی۔ خسروؔ نے پکھاوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے طبلہ کا مقبول عام ساز ایجاد کیا۔ ستار کی ایجاد کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ ستار کے تمام نغمے 'گیت' اور دوسرے امتزاجات خسروؔ کے بنائے ہوئے اسالیب کے مطابق ہیں۔

مشہور زمانہ نائیک گوپال نے ایک مرتبہ امیر خسروؔ کی مہارت کو علاؤ الدین خلجی کے دربار میں چیلنج کیا۔ خسروؔ نے پہلے گوپال کو اپنے فن کا ظاہرہ کرنے کا موقع دیا۔ گوپال نے کئی راگ اور نغمے سنائے۔ جب خسروؔ کی باری آئی تو اس نے سب سے پہلے گوپال کے گائے ہوئے راگ اور نغموں کا تجزیہ کیا اور ایک ایک نقص نکال کر ظاہر کیا۔ اور گوپال کو قائل کرایا۔ اس کے بعد اپنی موسیقی کے نمونے پیش کئے۔ جن کو سن کر سارا دربار مبہوت رہ گیا۔ یہ معرکہ خسروؔ کے ہاتھ رہا۔ موسیقی خسروؔ کے لئے اپنے مرشد کو عقیدت پیش کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ اس کے لئے فن کے اظہار کا ذریعہ کم اور عبادت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنا ایک نظام موسیقی پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔

تاریخ

خسروؔ باقاعدہ مورخ تو نہیں تھے۔ مگر اس دور کا کافی تاریخی مواد اپنی کتابوں اور کلام میں چھوڑا ہے۔ جو ان کے مقام کو ممتاز بناتا ہے۔ اس نے کم از کم پانچ طویل تاریخی نظمیں لکھیں۔ ابن بطوطہ محمد تغلق کے عہد میں

ہندوستان آیا۔ اور سات سال تک یہاں قیام کیا۔ ابن بطوطہ اور خسرو نے ہی اس دور کے متعلق تمام تاریخی مواد بہم پہنچایا ہے۔ جس کے بغیر اس دور کی سماجی، سیاسی اور تاریخی تصور نامکمل ہے۔ اگرچہ وہ ایک تاریخ نگار کا قلم وذہن نہیں رکھتا تھا۔ مگر اس کے بدلے ایک عظیم تخیل اور جامعیت مواد کے ساتھ وہ مورخوں کی صف میں جگہ پاتا ہے۔ خسرو کے حقائق اس لئے بھی استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ کہ خسرو کے لئے وہ تاریخی باب حال تھا قال نہیں تھا۔ خسرو ان سلاطین کے ساتھ رزم و بزم میں سانسیں لے رہے تھے۔ خسرو نے اس دور کی تاریخ کو چلتے پھرتے خود دیکھا تھا۔ اس دور کی کوئی تاریخ خسرو کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

اہم تصنیفات

1۔ تحفتہ الصغر :۔ شاعر کا پہلا مجموعہ اور شاعر کی ابتدائی جذباتی دور کی عکاسی کرتا ہے اس میں سیکھنے کا عمل جاری نظر آتا ہے۔

2۔ وسعت الحیات :۔ دوسرے مجموعے میں شعری صلاحیتیں ابھر اور نکھر کر سامنے آنے لگی ہیں۔

3۔ مفتاح الفتوح :۔ جلال الدین خلجی کی چار فتوحات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس میں عربی سائنس کے بارے میں بھی اظہار خیال ہے۔

4۔ دیول رانی :۔ خضر خان ایک تاریخی نظم ہے اس میں خضر خان اور دیول

رانی کے عشق کی داستان بیان ہوئی ہے۔ انداز بیان خوبصورت اور مرصع ہے۔

5۔ قرآن السعدین :۔ بغرا خان اور کیقباد کے تصادم کی داستان ہے۔

6۔ نہ سپر :۔ آخری دور کی یادگار ہے۔ اس میں قطب الدین مبارک شاہ کا دور پیش کیا گیا ہے

7۔ خزائین الفتوح میں علاؤ الدین خلجی کی فتوحات کا ذکر ہے۔ یہ نثر کی کتاب ہے اور تاریخ حقائق سے معمور ہے۔

8۔ تغلق نامہ :۔ اس میں تغلق خاندانی کی تخت شینی اور دوسری تاریخی باتوں کا ذکر ہے۔

9۔ اعجاز خسروی :۔ یہ عظیم نثری کارنامہ صوفیانہ تجربات و احساسات کو پیش کرتا ہے اور خسرو کا حاصل زندگی ہے ان کے علاوہ قصہ نقیہ' نہایت اکمال' مطلع انوار' شریں خسرو' لیلیٰ مجنوں' آئین سکندری' ہشت بہشت' افضل الفوائد وغیرہ بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ اس کے علاوہ معروف کتاب خلق باری کی تصنیف بھی ان سے منسوب کی جاتی ہے۔ خسرو تقریبا" 5 لاکھ اشعار کے خالق کئے جاتے ہیں۔ جو ان کی سو سے زیادہ کتابوں پر محیط تھے ۔ ان سو کتابوں میں سے صرف بیس' بائیس کتابیں ہم تک پہنچ پائی ہیں۔

الغرض خسرو کی داستان کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

بعد میں اگر گوش نہی برسر خاکم

ازخاک ہمہ نغمہ داوٗد سر آید

بے نظیر شاعر

نظیر اکبر آبادی ایک انوکھا اور نرالا شاعر ہے۔ شاعروں کی دنیا کا OUTCAST۔ اس نے جو لکھا اور روائتی شاعری کی کتاب سے باہر لکھا۔ قدامت پسند شاعری کے کسی فرمے میں وہ فٹ نہ بیٹھا۔ وہ دلی والا نہ لکھنؤ والا۔ آہ کا حامی نہ واہ کا پرستار۔ مضمون اس کے جدا۔ اسلوب اس کا اچھوتا۔ غزل کی زبان لکھی نہ قصیدے کی زبان اپنائی۔ عجیب آدمی تھا۔ شعر کہتا تھا اور ڈٹ کر کہتا تھا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں شعر لکھے۔ استاد بنا نہ شاگرد بنائے پر مضامین نو کے انبار لگاتا رہا۔ شاعروں مشاعروں اور درباروں سے دور۔ جن باتوں سے رسوم و قیود کے پابند شاعر دور بھاگتے۔ نظیر میاں اسے سینے سے لگاتا۔ اس کے لئے ہر موضوع شاعری کا موضوع ٹھہرا۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین اوراس کے بنائے سب لوگ اور انسانی زبان سے نکلے ہوئے سب الفاظ اس کے مذہب شعری میں پسندیدہ ٹھہرے تھے۔ اس کو کسی سے کد نہیں۔ اس میں کوئی غصہ نہیں۔ نفرت نہیں وہ کسی کا دشمن نہیں۔ سب کا دوست' سب کا غم گسار۔ زندگی کو خانوں میں بانٹنے کا قائل نہ زندگی کو فلسفوں میں لپیٹنے کا حامی۔ بس جو ہے جیسے ہے اس کو اس انداز میں پیش کر دیا جائے۔ اس کے ہاں آمد کا تصور نہ آورد کا خرخشہ۔ وہ بس جنریک انسان اور جنریک (Generic) شاعر تھا۔ قصور اس کا یہ تھا کہ وہ اس فیوڈل سماج میں آج سے دو سو برس قبل اس وقت پیدا ہو گیا تھا۔ جب ہر طرف انسان پابہ جولاں تھا۔ رسموں' رواجوں اور اپنے بنائے ہوئے تہذیبی زندانوں میں مقید۔ رئیس روٴساء' حکمرانی اور جاگیرداری میں پابند طبقہ اوسط تعلیم نوکری اور نام نہاد تہذیب و ثقافت کا ثنا خواں نچلا طبقہ غربت و افلاس کا مارا اور دوہری غلام کی سلوں تلے کراہتا۔ یہ طبقہ ہر دور کے طبقہ غربا کی طرح لاکھوں نہیں کروڑوں پر مشتمل تھا۔ تاریخ تہذیب اور روٹی پر اوپر کے اقلیتی طبقے اور اس کے ملازم طبقہ اوسط کا قبضہ تھا۔ نظیر اکبر آبادی طبقہ اوسط میں پیدا ہوا۔ مگر اس نے اوپر دیکھنے کی جگہ نیچے دیکھنا شروع

کر دیا۔ جہاں اسے قدم قدم پر معصوم خوشیاں، چھوٹی چھوٹی مسرتیں، ہنگامے، کھیل تماشے، موسیقی کے گونجتے بجتے نظارے، بے تضع اور بے محابا حسن و عشق کی گھاتیں نظر آئیں۔ نظیر اس دنیا میں کھو گیا۔ اس کا مدح خوان بن گیا۔ نظیر وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو اس کے ہم عصر دوسرے شاعر و دانشور بھی دیکھ رہے تھے۔ سب لوگ اسی رنگارنگی کا شکار بھی تھے۔ اور اس سے متلذذ بھی ہو رہے تھے۔ کون ایسا کھٹور اور مردم بیزار ہو گا۔ جو اپنے اردگرد ہونے اولے میلوں ٹھیلوں، عید ہولی، دیوالی، شب برات میں شریک نہ ہوتا ہو گا۔ کون ہو گا جو برسات، بہار، خزاں، گرمی، سردی کے لطائف و شدائد کا شاکی، شکار یا شوقین نہ ہو گا۔ کون تھا اس دور کے شعراء ادباء میں جس کا واسطہ ڈوم نائی، قصاب، کنجڑے، دھوبی اور دوسرے پیشہ ور حضرات سے نہ پڑتا ہو گا۔ کون تھا جو چیونٹی ہاتھی گدھے گھوڑے، کتے، بلیوں اور خدا کی اس زمین پر پائی جانے والی دوسری مخلوقات سے بے خبر ہو گا۔ کون ہو گا جو انسان کی خارجی زندگی کے معمولات روٹی رزق کے چکروں، گھریلو زندگی کی دانتا کلکل، سماجی تعلقات کے اتار چڑھاؤ اور سفر مسافرت کے چکروں سے آگاہ نہ ہو گا۔ سب آگاہ تھے۔ کیونکہ اسی آگہی کا نام زندگی ہے۔ مگر اکثر و بیشتر شعراء نے اس خارج کو چھوڑ کر صرف داخلی کیفیات کو توجہ کا مرکز بنایا۔ جو ہوتی ہیں دراصل اس خارجی خلفشار اور غم و نشاط کا پرتو مگر بقول افلاطون اصل زندگی کا سایہ کہلاتی ہیں۔ افلاطون نے اس سایے کے سایے کو شعر و ادب میں پیش کرنے کے جرم کی پاداش میں اپنی سلطنت سے شاعروں کو نکال باہر کیا تھا۔

نظیر کا کمال غلطی یا قصور یہی تھا۔ کہ اس نے زندگی کے پرتو یا اس کی تاثیر کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے کی جگہ زندگی کو براہ راست جا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی جھولی میں ڈالا۔ بالکل اس طرح جس طرح کوئی گرمی کا مارا شخص برستی برسات میں کپڑوں سمیت کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے۔ کپڑے جوتے ٹوپی، ساز و سامان سب بھیگ جاتے ہیں۔ وہ قہقہے لگاتا ہے۔ شور مچاتا ہے دوڑتا پھرتا ہے۔ اور زندگی کا

اصلی اور جزیک لطف حاصل کرتا ہے۔ وہ دودھ کو خشک کر کے اور پھر اس میں گرم پانی ملا کر دودھ بنانے کا قائل نہیں۔ بلکہ گائے بھینس کے تھنوں سے براہ راست حاصل ہونے والے کوسے دودھ کو اوک کے ذریعے یا براہ راست تھنور سے منہ لگا کہ پینے کا قائل تھا۔ زندگی کو دوسروں کی آنکھ یا خود اپنے دماغ' فلسفے یا جذبات کی آنکھ سے دیکھنے کی جگہ صرف خدا تعالٰی کی دی ہوئی دو آنکھوں سے دیکھنا اور جہاں ہے اور جیسے ہے کہ اصول کے مطابق ایک رنگ کنٹری کے طریقے سے اسے پیش کر دینا اس کا وظیفہ شعری تھا۔ چنانچہ زندگی کو ذہن کی آنکھ سے دیکھنے والوں نے اسے شاعر ہی ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ نظیر نے صدیوں کی مسلمہ روایت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ بنے بنائے پیمانے' نپے تلے الفاظ' گھڑے گھڑائے اسالیب' قافیئے ردیف' شعری سانچے' الفاظ تراکیب کو اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ اور اپنے شعری اور لفظیاتی نظام لے کر سامنے آگیا۔ سامنے کیا آگیا۔ ان کا تو کسی سے مقابلہ ہی نہ تھا۔ اسے درباروں' دفتروں میں اہل ثروت حضرات کو شعر سنا کر روٹی تھوڑی کمانی تھی۔ اسے مشاعروں کی محدود دنیا میں بیٹھ کر گھسی پٹی لکیروں کو پیٹ کر واہ واہ اور داد و تحسین کے ڈونگرے بھی اکھٹا نہیں کرنے تھے۔ وہ صلہ و ستائش اور شعر و ادب سے مال کمانے کے تصور سے آزاد و بے گانہ تھا۔ چھوٹا موٹا معلم تھا۔ دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ چھوٹا موٹا گھر تھا۔ سر چھپ جاتا تھا۔ غریب قبول صورت سی بیوی گھر میں موجود تھی۔ جو اس کے لئے حسب ضروت بچے جن دیتی تھی۔ تکبر و غرور و پرتضع انا اس میں تھی نہیں۔ اپنے سائز سے وہ بڑا بننے کے خواب دیکھتا نہیں تھا۔ کسی انسان کو چھوٹا بڑا وہ سمجھتا نہیں تھا۔ اس کے اردگرد درزی' نائی' قصاب' کنجڑے' ہیجڑے' ناچنے والے' ناچنے والیاں' کاریگر' قلی' مزدور اس قسم کے لوگ تھے۔ جن سے وہ پیار کرتا تھا۔ جن کا وہ یار تھا۔ وہ وقت کے فلسفیوں کی عام انسان سے بلند فلسفیانہ ان موشگافیوں کے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ جو عام انسان کو صرف ایک "عمومی انسانیت" کی اصطلاح کا

نام دے کے ساری زندگی کولھو کے بیل کی طرح اس کے گرد آنکھوں پہ علم کی پٹی باندھے پھرتے تو رہتے ہیں۔ مگر اصل انسان چھجو گھسیٹے' گامے رامے' راجو سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے بھی ہیں۔ تو اس کا ذکر اپنی شاعری' دانش اور کتاب میں کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔

نظیر نے ان سب رویوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ کوئی نعرہ لگا کر یا شعوری طور پر یہ سب کچھ کہہ کر نہیں۔ بلکہ سیدھے سادے براہ راست طریقے سے۔ فخرو مباہات کا تو اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ شاعری یا دانش کوئی فخر کرنے کی چیزیں ہیں۔ یہ تو زندگی کو سمجھنے کی باتیں ہیں۔ زندگی وہی ہے جو جس کی سمجھ میں آئے۔ جو جس پر بیتے۔ نظیر نے بھی اپنے اوپر بیتنے والی زندگی کو سامنے رکھا۔ کتابوں میں پائی جانے والی زندگی کو بھی ہاتھوں پاؤں سے کھینچ کر باہر نکالا۔ دھوپ میں ڈالا۔ بارش میں نہلایا۔ اور پھر اسے جوں کا توں اپنے الفاظ میں پیش کر دیا۔ نظیر کو سوچنے' سینکنے' سینچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ نہ اس کے پاس ان باتوں کے لئے وقت تھا۔ زندگی کوئی بھٹی میں پکائی جانے والی چیز نہیں۔ کیونکہ زندگی متحرک و فعال ہے۔ یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتی ہے۔ یہ ٹھہرے تو اسے اٹھا کر ذہن و قلب کی کٹھالی میں ڈال کر کندن بنائیں۔ یا فلسفے میں ڈھالیں مگر یہ ایک جگہ ٹھہرتی ہی نہیں۔ جو لمحہ ہمارے سامنے ہے یہی زندگی ہے۔ ہم اس لمحے کو منجمد کر کے دانش و حکمت کے ڈیپ فریز میں رکھنے کے تکلفات میں گرفتار رہیں۔ تو زندگی آگے گزر جائے گی۔ اور دوسرا منظر سامنے آجائے گا۔ جو زندگی کا ایک اور رخ یا نئی زندگی ہو گی۔

نظیر نے زندگی کو ٹکڑوں میں کاٹ کر اور نوالہ نوالہ ہضم کر کے اور پھر آنکھیں بند کر کے ایک ایک نوالے کو واپس لا کر اس کی جگالی کرنے کی رسم کو توڑ کر زندگی کے سامنے بیٹھ کر اپنی شاعری کے کینوس پر اس کی تصویر بنا ڈالی۔ جو وقت کے نقادوں کو

پسند نہ آئی۔ ایک تو یہ کہ اس قسم کی تصویر پہلے موجود ہی نہ تھی۔ کسی نے بنائی ہی نہ تھی۔ اس نے جو رنگ، برش، کینوس استعمال کیا۔ وہ نقادوں کے پاس تھا بھی تو انہوں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا۔ لکیر کے فقیر صرف اس چیز کو قابل توجہ جانتے ہیں۔ جس کا نمونہ پہلے سے موجود ہو۔ نظیر ان کے امتحان میں نہ بیٹھا نہ اسے ضروری تھی۔ وہ فیل ہو گیا۔ اس کی بلا سے اس نے اپنی شاعری کسی ثقہ ادیب شاعر و نقاد سے پاس فیل کے نمبر حاصل کرنے کے لئے نہیں پیش کی تھی۔ شاعری اس کے لئے اظہار و ابلاغ کا ایک وسیلہ تھی۔ اپنے اردگرد مچے تماشوں کو تماشوں کی ہی زبان میں پیش کر کے اور زیادہ تماشے بنانے اور حاصل کرنے کا۔ ثقہ قسم کی رسمی روائتی شاعری کرنے کے لئے شاعروں کی ایک ستاروں سے بڑھ کر لاتعداد کھیپ موجود تھی۔ جو زلف، کاکل، گردے، پھیپھڑے، دل کلیجے، کھوپڑی، انگلیوں، خون خرابے، ٹھنڈی آہوں، گرم نواؤں کی شاعری کر رہی تھی۔ نظیر نے اس کوچے کی طرف جانے کے متعلق سوچا ہی نہیں وہ قلندر تھا۔ بے نیاز تھا۔ مونڈھے پہ چادر، ہاتھ میں لاٹھی سوٹی لئے وہ فقیروں، کاریگروں، مزدوروں کے ساتھ تھڑوں، تکیوں اور بازاروں میں جا بیٹھا۔ چارپائیوں پر بیٹھ کر قہوہ سے پیئے۔ گپ شپ لگائی ٹھٹھا کیا۔ لطف اٹھایا۔ لطف عام کیا۔ چادر اٹھائی۔ ڈانگ اٹھائی۔ گھر آکر اپنے بال بچوں میں بیٹھ کھانا کھایا اور لمبی تان کر سویا۔ نہ ہائے ہائے نہ کھائے کھائے۔ بال نوچنے، ستارے گننے، آہیں بھرنے، اور چاند کو دیکھ دیکھ کر راتیں گزارنے کی اسے فرصت نہ تھی۔ وہ تھکا ہوا عام سا آدمی تھا۔ جو آرام سے نان سٹاپ نیند کرنا چاہتا تھا۔ نظیر اس قسم کا انسان اور اس قسم کا شاعر تھا۔ اکہری زندگی تھی۔ اکہری شاعری تھی۔ نہ زندگی پر ملمع تھا نہ شاعری پر۔ اس زمانے میں بھی عوام الناس صرف حقارت کی نگاہ سے دیکھنے جانے کی چیز تھے۔ ان کو شاعری کا موضوع بنانا تو کفر کا اعلان کرنا تھا۔ نظیر نے یہ کفر کر دکھایا تھا۔

وہ عوام الناس کا شاعر تھا۔ چنانچہ شعری روایتوں کے امین ادب نے اس کو کافر

قرار دے دیا۔ نظیر زور آور آدمی تھا۔ زندگی سے بھرپور زمانے کا یار اور زمین سے بہت قریب زمین۔ زمانے کی یاری نے اسے قوت مند بنا دیا تھا۔ زندگی کے ہر طبقے کے لوگوں سے محبت کرنے کے صلے میں اس کا دامن محبت کے موتیوں سے بھر گیا تھا۔ اس کو ایک ایسی ڈکشن مل گئی تھی۔ جس کا تصور بھی روائتی شاعر اور نقاد نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ اس ڈکشن اور لفظیات کے اوپر سے پائنچے اٹھا کر اور چھی چھی کر کے گزرتے تھے۔

نظیر نے انہی لوگوں کو لفظیات کو اپنایا جن کے اندر وہ بس رہا تھا۔ اور جو اس کی باتوں کو سمجھتے تھے۔ جن تک وہ اپنا کلام پہنچانا چاہتا تھا۔ ان تک پہنچ گیا۔ نقادوں تک نہیں پہنچا۔ اور اگر پہنچا اور انہوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا تو نظیر کے لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ نظیر خواص کا شاعر تھا ہی نہیں۔ عوام کا عوامی شاعر تھا۔ اپنے دور میں سب سے الگ سب سے منفرد۔ آج تک سب سے جدا ہے۔ صدیاں گزر گئیں۔ اب بعض حلقے اس کو اردو کا سب سے بڑا عوامی نظم گو مانتے ہیں۔ اس نے نظم کا چراغ اس وقت جلایا۔ جب غزل اور قصیدے کا سورج روشن تھا۔ اب جب نظم کا زمانے آگیا ہے تب بھی اس کو وہ مقام نہیں دیا جاتا۔ جس کا وہ مستحق ہے۔ نظیر نے لاکھوں شعر کہے۔ لاکھوں نئے الفاظ ادب کے دامن میں بھرے ۔ شاعری اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔ اس کو کلام پر اسقدر قدرت حاصل تھی۔ کہ وہ جس قسم کی شاعری کرنا چاہتا کر سکتا تھا۔ قصیدے لکھتا تو بڑے بڑے قصیدہ گویوں کو پیچھے چھوڑ جاتا۔ مثنوی لکھتا تو اس کو کہاں سے کہاں لے جاتا۔ مرثیے لکھتا تو اس کا کوئی ثانی نہ ہوتا۔ غزل کا مزاج اس سے اور اس کا مزاج غزل سے جدا تھا۔ وہ اپنے زور کلام سے جس میدان میں جاتا جھنڈے گاڑ دیتا۔ مگر اس نے صرف عوامی نظم کا میدان چنا۔ اور اس کا سب سے بڑا شاعر قرار پایا۔ ابھی عوام کا زمانہ چونکہ نہیں آیا۔ اس لئے نظیر کی اہمیت اس طرح تاباں نہیں ہوئی۔ وہ زمانہ کبھی تو آئے گا۔ جب عوامی

شاعری کا یہ بے تاج بادشاہ اپنی مسند پر بٹھایا جائے گا۔ یہ مسند صرف اس کے لئے بنی ہے۔ مگر ابھی تک خالی ہے وہ بے نظیر شاعر تھا۔ اس کی شاعری اپنا ایک جداگانہ حسن رکھتی ہے۔ جس کی طرف پڑھے لکھے لوگ عام طور پر آتے نہیں۔ مگر جب آتے ہیں۔ تو پھر وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے۔ رنگ ہر طرف بکھر رہے ہوتے ہیں۔ سفید پوش اپنے عمامے بچا بچا کر گزرتے ہیں۔ مگر ایک دفعہ دھکا دے کر ان کو اس رنگ ترنگ کی دنیا میں ڈال اچھال دیا جائے۔ تو وہ دوسروں سے بڑھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک بچہ' ایک کندہ نا تراش انسان' ایک لا ابالی نوجوان' ایک گنہگار بوڑھا' ایک بگڑا ہوا آدمی کا بچہ ہوتا ہے۔ جو کھل کھیلنا چاہتا ہے۔ مزے اڑانا چاہتا ہے۔ جو بھوک پیاس کے ہاتھوں بلبلا کر رونا چاہتا ہے۔ جو زمین زمانے اور حکومتوں کو کوسنا چاہتا ہے۔ نظیر کا ہیرو یہی عام انسان ہے۔ وہ خود بھی یہی انسان تھا۔ اس نے اس انسان کے جذبات احساسات' حرکات و سکنات' غلطیوں' غلط کاریوں' تماشوں کو شعروں کے سانچے میں ڈھالا ہے۔' اس کی شاعری پڑھ کر ہم اس انسان سے واقف ہوتے ہیں۔ جو ہمارے اندر موجود ہے۔ مگر جسے ہم تہذیب اور دانش و حکمت کے لبادے میں ڈھانپ کر اپنے آپ اور زمانے سے چھپاتے پھرتے ہیں۔ نظیر کا سارا ہی کلام پڑھنے کی چیز ہے۔ مگر کچھ چیدہ نظمیں لاجواب شاہکار ہیں۔

الٰہی نامہ

الٰہی نامہ نظیر کی ایک خوبصوت حمدیہ نظم ہے۔ جس میں انتہائی سادگی کے ساتھ رب جلیل کی ثناء کے پھول مہکائے گئے ہیں۔ اس مخمس کا پانچواں مصرعہ تو اپنی مثال آپ ہے۔

۔ کل عالم تیری یاد کرتے تو صاحب سب کا سچا ہے

اس ایک مصرعے کے اندر جہاں معنی بند ہے۔ نظم کے پہلے بند سے لے کر آخری بند تک ایک ہی روانی ہے۔ جزئیات و لفظیات کی بھرمار ہے۔ زبان و بیان پر جوان کو عبور حاصل ہے۔ اس کا اظہار ہر ہر مصرعے سے ہوتا ہے۔ ہر بند ایک الگ ہی داستان سناتا ہے۔ ارض و سما کی رونق بھیڑ بھاڑ کو پھم پھا سے تعبیر کر کے ایک تصویر کھینچ دی ہے۔ پھر سب حیوانوں' انسانوں اور ان کی اقسام کو جمع کر دیا ہے۔ حیواں' پکھیرو' نرناری بوڑھا بالک بچہ' دانا' بینا' ہوش بھرا' بھولا ناداں کچا سب کا ذکر کر کے عظمت الٰہی کو بیان کیا ہے۔ ہر رنگ' نسل اور مذہب کے لوگ اس ایک خدا یا خالق کائنات کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ نام الگ الگ ہیں زبان الگ ہے۔ مگر ذکر ایک ہی رب کا ہے۔ خالق باری' رب' رحیم' مولا' رحماں' اللہ' نرکال نرجن' رام' شیو' داناد نیت' راجیس' دیوت' اظہار کے مختلف پیرائے ہیں۔ ذکر ایک ہی محبوب کا ہے۔

نظیر نے دریا اور آبی مخلوقات کا ذکر کر کے انہیں بھی اللہ کی مدح و ثناء میں مصروف دکھایا ہے۔ نباتات کا ذکر کیا ہے تو کسی پھول بوٹے درخت کا نام نہیں چھوڑا ہے۔ ایسے ایسے نام گنوائے ہیں کہ سوائے ماہرین نباتات و حیوانات کسی کو کیا معلوم ہوں گے۔ پھول' سبزیوں' پرندوں' چرندوں' درندوں کے ناموں کی قطاریں لگا دی ہیں۔ گج گینڈا' ارنا شیر' پلنگ' آہو' ہرنی' روبہ گیدڑ' سیہی' نیولا' سانڈا' بچھو' افعی' چیتل' چیتی' اژدر' گج کوہی' پاڑا' گرگ' چرغ' گرگٹ' چلپاسہ' موس دگر' جل مانس' بن مانس' ہاتھی' گھوڑا' پیل شتر کسی کو نہیں چھوڑا۔

اتنے نامانوس اور غیر شاعرانہ نام گنوانے کے باوجود نہ نظم کی روانی میں فرق آیا ہے۔ نہ معنویت میں الجھاؤ پیدا ہا ہے۔ بوجھل نظم ایک نرم میٹھی مستانی روانی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ نہ دلچسپی کا عنصر ختم ہوتا ہے۔ نہ **نغمگی** دم توڑتی ہے۔ پھر ٹیپ کا مصرعہ کا عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے۔ حسن و خوبی کے ساتھ سب کیفیتوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔

اس ارض و سما کے عرصے میں جتنا کھم کچھا ہے
یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے۔ یہ رنگ تجھی نے رچا ہے
حیوان پکھیرو نر ناری کیا بوڑھا بالک بچہ ہے
کیا دانا بینا ہوش بھرا کیا بھولا نادان کچا ہے
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

ہشیار دانا مست سڑا عیار نظیر ناقص کامل
سردار غریب ادنیٰ زیرک سیانا نادان غافل
رمال نجومی گھڑیالی ملا بھمن پنڈٹ عاقل
کیا بید مہندس ابجد پنڈنٹ عالم فاضل کیا جاہل
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

آدمی نامہ

یہ نظم نظیر کب سب سے مقبول، معروف اور بے مثال نظم ہے۔ اس کے بند اور مصرعے لوگوں کے دلوں پہ نقش ہیں اور ضرب مثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ انسانی زندگی، اس کی نفسیات، اس کے اتار چڑھاؤ پر اس سے بہتر اور خوبصورت نظم کہنا امکان سے باہر ہو گیا ہے۔ غربت و افلاس اور امارت و ثروت کے کیا کیا نقشے کھینچے ہیں۔ کس کس طرح سے معاشی اور معاشرتی تضادات کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر اولاد آدم کے ابدی استحصال کا ماتم کیا ہے۔ یہ باتیں اس دور کے لحاظ سے ایک بہت بڑے شعری، شعوری اور ذہنی انقلاب کا پتہ دیتی ہیں۔ نظیر کی یہ نظم ان کے

ذہن، افق اور فراخی قلب و نظر کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ وہ انسان کی سب خامیاں، برائیاں اور جرائم بیان کرنے کے بعد بھی ان سے نفرت نہیں کرتا۔ ان کو دائرہ انسانیت و آدمیت سے خارج نہیں کرتا۔ جوتیاں چرانے اور نماز پڑھنے والے دونوں آدمی ہیں۔ فرعون، شداد، نمرود سبھی آدمی ہیں۔ پگڑی باندھنے اور پگڑی اچھالنے والے دونوں آدمی ہی ہیں۔ ناچنے والا بھی آدمی نچانے والا بھی آدمی

اشرف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہلاتا ہے یاں نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کا نظریہ آدمیت سماج کے کم ظرف اجارہ داروں کے تصور معیار سے بہت بلند اور ارفع ہے۔ نظم کے بند بند اور مصرعے مصرعے میں وہ ایک محبت کرنے والا اور انسانی زندگی کے المیوں پر کف افسوس ملنے والا ایک ہمدرد انسان نظر آتا ہے۔ وہ کسی بھی جگہ متعصب نہیں ہوا ہے۔ کہیں ڈنڈی نہیں ماری ہے۔ بس جو ہے اسے آئینہ دکھایا ہے۔ اس لحاظ سے نظیر اپنے وقت کا بہت بڑا حقیقت نگار ٹھہرتا ہے۔ جو کچھ اس نے محسوس کیا ہے اسے بلا کم و کاست اسے بیان کر دیا ہے۔ زخموں کو ننگا کیا ہے۔ علاج اس نے نہیں دکھایا اور نہ اس کا کام تھا۔ وہ تو معاشرتی زندگی کا ایک بے خوف و بے طمع فوٹوگرافر تھا۔

نظیر کی نظم آدمی نامہ سہل ممتنع کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں غیر مانوس الفاظ کم آئے ہیں۔ روانی کی بہار وہی ہے جو نظیر کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ آج بھی مفلس و گدا کو آدمی سمجھنے کا رواج کم ہے۔ مگر نظیر نے اسی زمانے میں یہ نعرہ لگا کر شاعروں کو راہ دکھائی تھی۔

ناچے ہے آدمی ہی بجا تالیوں کو یار
اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار اتار
ننگا کھڑا اچھلتا ہے ہو کر ذلیل و خوار
سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اس کو بار بار
اور وہ جو مسخرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا سو ہے وہ بھی آدمی

فنا نامہ نمبر1

اس نظم میں دنیا کی بے ثباتی کے مضمون کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ فنا کا مضمون تو اکثر شاعر اپنی نظموں غزالوں میں باندھتے رہتے ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی کا رونا کو شاعروں کا من پسند موضوع رہا ہے۔ مگر نظیر نے زندگی حقیقتوں کی جو تصویر کشی کی ہے اسے پڑھنے کے بعد تو واقعی دل زندگی سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے فنا نما پہلو کا جو عکس پیش کیا ہے اس سے ان کے قدرت کمال کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔ نظیر نے جہاں میلوں ٹھیلوں کی مرقع کشی اپنی نظموں میں کی وہاں زندگی کی دلچسپیوں، رنگینیوں اور رعنائیوں کو اس دلفریب انداز میں بیان کیا کہ آدمی کو زندگی اور دنیا کا دیوانہ بنا ڈالا۔ یوں لگتا ہے کہ دنیا میں اس کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ مگر جہاں نظیر نے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت پر قلم اٹھایا ہے۔ تو وہاں ان کے قلم نے زندگی کے لذتوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے ہیں۔

نظیر کی مسدس فنا نامہ اس لحاظ سے ایک بڑی نظم ہے۔ کہ اس میں شاعر نے زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ہر پیشے، کاروبار، علم و حکمت کا تجزیہ کیا ہے۔ فن، علم، رتبہ، اقتدار، دولت، جائیداد، سب بے معنی اور بے ثبات ہیں۔ جب کلک قضا نے حرف لکھے اور سیف اجل کر آ چمکی تو سب کوٹھی کوٹھے بیٹھ گئے۔ سب کھیتی باڑی کھیت ہوئی۔ دالان کتابوں سے روکیں یا صندوق نسخوں سے بھریں، حاکم محکوم، خادم مخدومی جاہل مجہول، عاق معقول زر دار بے زر آخر کو سب دھول ہوئے عمر گزر گئی۔ آخر شب یہ کھلا کر خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ جو کچھ بھی کیا بے کار گیا۔

سب جیتے جی کے جھگڑے تھے سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

یہ نظم قنوطیت کی ترجمان نہیں ہے۔ نظیر قنوطی ہرگز نہ تھا۔ وہ زندگی کا وہ پہلو سامنے لا رہا ہے۔ جو حق ہے اور حقیقت ہے۔ ہم اسے پسند کریں یا نہ مگر اس پہلو کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فنا نامہ عبرت و توبہ کی ایک عمدہ تصویر ہے جسے پڑھ کر انسان نہ صرف شاعری کی فنکارانہ عظمت کا قائل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ زندگی کی بے جا ناز برداری کا تصور بھی دل سے نکل جاتا ہے۔ نظم کا بڑا حسن اس کا ٹیپ کا مصرعہ ہے۔ جو امن و آشتی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس دنیا کی دھن دولت میں گر شاہ سلیمان جاہ ملے
یا ٹھہرے میر و وزیر اعظم یا راجہ بن کر آہ چلے
منہ دیکھ اجل کے لشکر کاتب لے کر گھر کی راہ چلے
نے ہاتھی گھوڑ سنگ گئے نہ تخت چھتر ہمراہ چلے
سب جیتے جی کے جھگڑے میں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

کر بیر بخیلی زہر ہوئے یا بخشش میں تریاک ہوئے
یا نخل ہوئے پر میووں کے یا خالی پاتوں ڈھاک ہوئے
یا عمر گزاری عشرت میں یا سو غم میں غمناک ہوئے
پھول پھل کھلائے گلشن کے گلیوں کی خاشاک ہوئے
سب جیتے جی کے جھگڑے میں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

فنا نامہ نمبر2

فنا نامہ کی پہلی نظم مسدس میں لکھی گئی۔ یہ دوسری نظم بھی اسی موضوع پر ہے۔ مگر مخمس کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی وہی زندگی کی بے حقیقتی، اس کے دکھ، اس کی تلخیاں بیاں کی گئی ہیں۔ لہجہ اور پیرایہ دل گداز اور جان سوز ہے۔ یہ نظمیں نظیر کی زندگی کے آخری ایام سے متعلق ہیں۔ جب وہ زندگی کے تمام مراحل سے گذر کر بیتی ہوئی یادوں کے چراغ جلا کر بصیرت کے پھول اگا رہے تھے۔ اسے پچھتاوے کی نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں کسی بھی جگہ ذاتی حوالہ موجود نہیں۔ زندگی کی عمومی کیفیات ہیں۔ جو ہر شخص پر گزرتی ہیں۔ زندگی کا زیرو بم ہمیں کس کس گلی میں لے جاتا ہے۔ سانس کی ڈوری کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پھر جب سب کچھ پا لیا جاتا ہے۔ اور انسان غرور و تمکنت کے سنگھاسن پر سوار دنیا کو چشم حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس لمحے فضا کا پنجہ غیب سے نمودار ہو کر سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔ نظیر کہتا ہے کہ اس لمحے کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ لمحہ اٹل ہے۔ آنی ہے۔

نظیر نے اس نظم میں بڑے گھمبیر پیرائے میں زندگی کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں

کو براہ راست چیلنج کیا ہے۔ گر شاہ سر پہ رکھ کر افسر ہوا تو پھر کیا۔ سب ملک سب جہاں کا سردار ہوا تو پھر کیا۔ دارا و جم سکندر و اکبر ہوا تو پھر کیا۔ ملک و مکاں خزانہ و لشکر ہوا تو پھر کیا۔ یہ دو دن کا چرچا گھر گھر ہوا تو پھر کیا۔ جب پنجہ قضا کا نمودار ہوا تو پھر کہاں کے میرے کہاں کے خاں۔ سر سرفرازوں کے کٹ گئے۔ سب کچھ مٹ گیا' فنا ہو گیا۔ بادشاہ وزیر' عالم' عاقل حکیم درویش' جرنیل' فقیر کسی کو موت اور فنا سے چھٹکارا نہیں۔

کیا ہندو اور مسلمان کیا رندو گبر و کافر
نقاش کیا مصور کیا خوشنویس شاعر
جتنے نظیر ہیں یہاں اک دم کے ہیں مسافر
رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطر یہاں گھر ہوا تو پھر کیا

نظیر نے اس نظم میں فنا' موت اور زندگی کے بے ثباتی کی رلا دینے والی تصویریں پیش کی ہیں۔ اس نظم میں ان کا لہجہ جارحانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب کچھ پا لیا تو پھر کیا۔ دنیا مایا جال ہے۔ مکرو فریب ہے۔ اس سے دور رہنا چاہیے۔

اگر شاہ سر پر رکھ افسر ہوا تو پھر کیا
اور بحر سلطنت کا گوھر ہوا تو پھر کیا
ماہی علم راتب پر زور ہوا تو پھر کیا
نوبت نشان نقارہ در پر ہوا تو پھر کیا
سب ملک جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا
کتوال بن کے بیٹھایا صدر ہو مقرر
فاسق ڈرے ہزاروں اور چور کانپے تھر تھر
آیا قضا کا مروہا جس دم چھڑی اٹھا کر

دو دن کا خوف خطرہ درد در ہوا تو پھر کیا

کلجگ

نظیر نے اس نظم میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دنیا کی باتوں کا دنیا ہی میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگلا جہان بے شک موجود ہے۔ وہاں یقیناً ہمارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا۔ اور ہمیں ہمارے کرنی کی سزا بھگتنی ہو گی۔ مگر کچھ بلکہ اکثر باتوں کا فیصلہ یہاں اس عالم فانی میں بھی ہو جاتا ہے۔ نظیر نے تو اس نظم میں فیصلہ ہی دے دیا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے یہیں ہو گا۔ جو کرے گا سو بھرے گا۔ میوہ کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے، آرام دے آرام لے، دکھ درد دے آفات لے اس مسدس کا ٹیپ بند بڑا پر معنی اور حقیقت افروز ہے۔

کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات کو لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

دراصل اس نظم کا نام کر جگ ہونا چاہیے۔ کیونکہ نظیر نے اس میں سارا زور یہ ثابت کرنے پر لگایا ہے کہ دنیا ہی دراصل ہماری دار مکافات ہے۔ یہ کلجگ یا اندھیری نگری نہیں ہے۔ کہ انسان ظلم و ستم جرم و جفا کر کے صاف نکل جائے۔ ایسا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم۔ یہاں جو بوئے گا سو کاٹے گا۔ جو اور کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے گھر۔ اور جو اور کے مارے چھری اس کے بھی لگتا ہے چھرا۔ کل دیوے گا کلپاوے گا۔ کلپاوے گا۔ کلپاوے گا۔ رحمان کو رحمان ملتا ہے اور شیطان کو شیطان۔ نظیر نے ساتھ چیلنج بھی کیا کہ

گر تجھ کو یہ باور نہیں تو، تو بھی کر کر دیکھ لے

اس نظم میں اپنی دوسری نظموں کے مقابلے میں انہوں نے کچھ نتیجہ بھی نکالا ہے۔ اور حرف نصیحت بھی ادا کیا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ

یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر

نظیر نے اپنے لئے بھی ایک راہ کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک بن کر رہ کیونکہ یہاں پاک رہ بے باک رہ کا اصول کار فرما ہے۔

زندگی کے بارے میں نظیر کے جو مشاہدات و تجربات ہیں۔ اور زندگی نے جس طرح اس کو ڈسا ہے۔ اس کی جھلک اس میں جا بجا ملتی ہے۔ یہ نظم نظیر کے محتاط رویوں کی ترجمان ہے۔ حالات کے ڈسے ہوئے ایک ایسے انسان کی داستان ہے جو امن و سکون اور خاموشی کی بے خطر راہوں میں اپنی زندگی کے دن بتانا چاہتا ہے۔ نظیر اپنی نظموں میں حقیقت کے مختلف رخ دکھانے کے ساتھ ساتھ کچھ نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔ اس میں بھی واضح نتائج خلوص بھری نصیحتوں کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلا نیک ہے۔ بد سے بری کی بات ہے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
جو گل کھلا دے اور کا' اسکا گل کھلتا بھی ہے
جو اور کا کیلے ہے منہ اسکا ہی منہ کلتا بھی ہے
جو اور کا چھیلے جگر اس کا جگر چھلتا بھی ہے
جو اور کو دیوے کپٹ اس کو کپٹ ملتا بھی ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ہاں دن کر دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

مفلسی

اس مخمس میں نظیر نے مفلسی اور تنگ دستی سے پیدا ہونے والی معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی کیفیتوں اور خرابیوں کو قلم بند کیا ہے۔ یہ مخمس خاصا طویل ہے۔ اور اس میں نظیر نے مزے لے لے کر افلاس و بے سرو سامانی کی رذالتوں کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ نظیر خود بھی ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جی بھر کر اس شیوہ پیغمران سے لطف اندوز ہوئے تھے۔ اس لئے مفلسی کے بیان میں ان کا قلم فراٹے بھرتا نظر آتا ہے۔ مفلسی ان کے لئے حال تھی قال نہ تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ مفلسی کے عالم میں انسان کی تمام خوبیوں اور محاسن پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ انسان بے توقیر اور بے تکریم ہو کر خود اپنی نظروں میں گر جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اہل فضل و کمال جو ہر دم فکر و دانش کے موتی بکھیرتے ہیں۔ جب مفلسی کے جال میں گرفتار ہوئے تو کلمہ تک بھول گئے۔ کوئی الف پوچھے تو بے بتاتے ہیں۔ نظیر کہتے ہیں کہ مفلسی کے دور میں ایسا مقام بھی آتا ہے کہ

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ جال
سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال

مفلس عزت نفس سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ اور دو روٹیوں کے لئے اپنی غیرت کو نیلام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے ان پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر

نظیر نے مفلس کے گھر کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ جو حقیقت کے بہت زیادہ قریب ہے۔ یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔ جس کی صداقت پر ہر بندہ بشر گواہ ہے۔

بی بی کی نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے
کپڑے میاں کے بنیئے کے گھر میں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں اڑے رہے
زنجیر نہ کواڑ نہ پتھر گڑے رہے

مفلس شخص اور اس کے اہل خاندان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کا لڑکا اگر کسی کے بچے کو پیار سے اٹھا لے تو بچے کے ماں باپ بچے کو فوراً" واپس لے کر اس کے ہاتھ پاؤں دیکھتے ہیں کہ کہیں اس سے زیور نہ اتار لئے گئے ہوں۔

فلس کسی کا لڑکا کا جو لے پیارے سے اٹھا
باپ اس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کڑا
کہتا ہے کوئی جوستی نہ لیوے کہیں چرا
نٹ کھٹ اچکا چور دغا باز گٹھ کٹا
سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

نظیر نے مفلسی و بدحالی کا شعرو شاعری میں نقشہ اس وقت کھینچا جب اس کا ذکر شاعروں نے خود اپنے اوپر شجر ممنوعہ قرار دے رکھا تھا۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ شاعر خود غربت و افلاس کی ماری ہوئی مخلوق ہے۔ وہ درباروں سے وابستہ رہ کر نان و نفقہ کا بندوبست کرتی رہی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ شاعر لوگ افلاس بھوک بیماری کا ذکر اس تواتر کے ساتھ کرتے کہ استحصالی نظام کی جڑیں ہل جاتیں۔ مگر اپنی درباری وابستگیوں کی وجہ سے شاید خاموش رہے کیونکہ بادشاہ، حکمران اور جاگیردار غریب شاعر کو تو دل

بہلاوے کے لئے برداشت کر لیتے تھے۔ مگر غریب کے منہ سے غریبی کا ذکر ان کے لئے ناپسندیدہ تھا۔ بہر کیف نظیر نے شعوری یا لاشعوری طور پر اس خود ساختہ خاموشی کا طلسم توڑا۔ ایک روایت قائم کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے بیسویں اور اکیسویں صدی کے غریبوں کو اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان کا ایک غم خوار گزرا ہے۔ جس کا نام نظیر اکبر آبادی تھا

جب آدمی کے حال یہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
یہاں تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پر کہ آتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آکر پڑے شمار
مفلس کو دیویں ایک تونگر کو چار چار
گر مانگے اور وہ تو اسے جھڑکیں بار بار
اس مفلسی کا آہ بیان کیا کروں میں یار
مفلس کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں میں بٹھاتی ہے مفلسی

دوالی

دوالی ہندوؤں کا ایک مذہبی تیوہار ہے۔ جس کے موقع پر گھر گھر چراغ جلائے جاتے ہیں۔ میلے کا سماں ہوتا ہے۔ بازار لگتے ہیں۔ دکانیں سجتی ہیں۔ گانا بجانا کھانا پینا اور کھیل تماشہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی رواداری کے پیش نظر سب مذاہب کے لوگ یہ تیوہار مل کر مناتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔ نظیر نے بھی بحیثیت مسلمان اپنے ہندو دوستوں اور ہمسایوں کے ساتھ مل کر اس تیوہار سے لطف اٹھایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نظم میں اس تیوہار کی مناسبت سے اپنے خیالات کو نظم بند کیا ہے۔ اور ایسا حقیقی نقشہ کھینچا ہے۔ کہ آج دو سو سال بعد آدمی کو اس شغل میلے میں شرکت کا احساس ہوتا ہے۔ میلے کے موقع پر جوئے بازی بھی ہوتی ہے۔ اور غریب امیر سب جوا کھیلتے ہیں۔ ہار جیت کے نتیجے میں گھروں کے اندر جو معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تفصیل ہی نظم میں موجود ہے۔

کسی نے گھر کی حویلی گروی رکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری
کسی نے گٹھڑی پروسن کی اپنی لاہاری
کسی کو جو رو کہے ہے پکار دے بھڑوے
بہو کی نوگرھی بیٹے کے ہاتھ کے کھڑوے
حویلی اپنی تو ایک داؤ پر میں ہاروں گا
یہ سب تو ہارا ہوں خندی تجھے بھی ہاروں گا

دوالی ایک ایسا تہوار ہے۔ کہ جس میں چھوٹے بڑے نیک بد سب پوری توانائی

کے ساتھ دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک عام روایت ہے۔ تہواروں کے موقع پر وہ کام بھی کر لئے جاتے ہیں۔ جوعام دنوں میں روا نہیں رکھے جاتے۔ مثلاً جو آدمی جوا نہیں کھیلتے۔ مگر شادی بیان خوشی کے موقع پر شریف شرفا بھی لطف کو دوبالا کرنے کے لئے اس رنگ کی دو چار چھینٹیں اڑا لیتے ہیں۔ جوئے کا نتیجہ چونکہ اکثر خواری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس لئے نظیر نے یہ چاہا ہے کہ اس نظم کے حوالے سے پیشہ ور جواریوں کے ساتھ ساتھ غیر پیشہ ور فصلی جواریوں کو بھی پندو نصائح سے نوازیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں خود بھی دوالی کا جواری ہے۔ اس لئے دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی نصیحت کرتا ہے۔ جوئے کی خرابیاں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی برائیوں کو گنوانے کے بعد وہ کہتا ہے۔

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانیو یارو
نصیحتیں ہیں انہیں دل میں ٹھانیوں یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو
جو جواری ہو نہ برا اس کا مانیو یارو
نظیر آپ بھی ہے جوار یا دوالی ہے

یہ نظم مخمس کے طور پر لکھی گئی ہے۔ ابتداء میں دوالی کی بہاریں اور مزے بیان کئے ہیں۔ پھر گریز کر کے دوالی کے موقع پر ہونے والی بے قاعدگیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک خاندان کا قصہ سنایا ہے۔ جس کا مرد دیوالی کے موقع پر سب کچھ ہار کر گھر لوٹتا ہے تو پھر اس کی کیا درگت بنتی ہے۔ یہ قصہ سنانے کے بعد وہ پھر نصیحتوں کا پٹارہ کھولتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دوالی کی منظر کشی کے ساتھ اس کے ساتھ وابستہ نامشکور صورتیں بھی سامنے آجائیں۔ بہرکیف دوالی کی نظم مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ پر کیف اور موثر بھی ہے۔

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار

کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے کھیلوں بتاسوں کا گرم ہے بازار
ہر ایک مکان میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کی

کسی کو جورو کہے ہے پکار دے بھڑوے
بھو کی نوگرھی بیٹے کے ہاتھ کے کھڑوے
جو گھر میں آوے تو سب ملک کہیں میں سو گھڑوے
نکل تویاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے
خدا نے تجھ کو تو شہدا کیا دوالی کا

تجھے خبر نہیں خندی یہ لت وہ پیاری ہے
کسی زمانے میں آگے ہوا جو جواری ہے
تو اس نے جورو کی نتھ اور آزار اتاری ہے
ازار کیا کہ جو رو تلک بھی ہاری ہے
سنا یہ تو نے نہیں ماجرا دوالی کا

زمستان نامہ

نظیر موسموں، رنگوں، کیفیتوں کا شاعر ہے۔ اندرونی کیفیات کو بیان کرنے کی اس کو وہ قدرت نہ ہو جو غزل کے داخلیت پسند شاعروں کا طرہ ہے۔ اس کے کلام میں وہ سوز و تپش نہ سہی جو میر کا کمال فن کہلاتا ہے۔ غالب جیسی عالی دماغی اور فلسفیانہ دانش کاری بھی ان کے ہاں نہ ملے گی۔ مگر جہاں داخل سے نکل کر خارج کا بیان آتا ہے جہاں مناظر فطرت، موسمی کیفیات اور خارجی ظواہر کی مرقع کشی کا تعلق ہے۔ وہاں

نظیر کا کوئی حریف نہیں۔ لفظوں کے پرے کے پرے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ متبادلات و مترادفات کی قطاریں دست بستہ حاضر ہوتی ہیں۔ گھن، گرج، شور، ہنگامہ، لہروں، طوفانوں اور دوسری غیض و غضب سے معمور کیفیتوں کے بیان میں نظیر کو جوید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کے عشر عشیر بھی دوسرے شعراء کرام کے حصے میں نہیں آیا۔ بعد کے شاعروں میں شاید جوش ملیح آبادی نظیر کے میدان میں کامیابی سے داخل ہوئے۔ نظیر نے منظر کو بیان کرنے میں کسی بھی لفظ کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ وہ عوامی تھا یا بازاری نظیر کو اس سے سروکار نہیں تھا۔ ہر قسم کا اینٹ پتھر روڑہ استعمال ہو۔ مگر منظر کی عمارت ایسی اٹھے کہ دیکھنے والے واہ واہ کہہ اٹھیں۔ زمستان نامے میں نظیر کا یہ فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ نظیر نے لفظوں کے ذریعے سردی کے موسم کی کپکپاہٹ کو اس چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ کہ موسمی ہواؤں کی ٹھڑاہٹ رگوں میں سردی اتارتی نظر آتی ہے۔

ے ہوو شور پھپو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی کی

لفظوں کی ایسی بنت ہے کہ سردی خود پکارتی ہے کہ میں یہاں ہوں۔ مثلاً" دن کا جلدی جلدی چلنا۔ تھر تھر کا زور اکھاڑ، بجتی ہوئی بتیسی، کلے پر کلہ لگنا، ایسی کیفیات ہیں جن سے موسم کی شدت کا ازخود اندازہ ہو جاتا ہے اور پھر موسم سرما کا چلہ اور اس کا عروج ان کے اس بند سے مکمل طور پر جھانکتا نظر آتا ہے۔

ہر ایک مکاں میں سردی نے آباندھ دیا ہو یہ چکر
جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑا کڑ اور تھر تھر
بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر
جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لے لے کر
سناٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

نظیر نے نہ صرف موسم کی منظر کشی کی ہے بلکہ اس کے سماجی اور معاشی اثرات کو بھی

زندگی کے مختلف طبقوں پر مرتب ہوتا دکھایا ہے۔ غریب کی سردی، امیر کی سردی، عاشق کی سردی، معشوق کی سردی، جوان کی سردی، بوڑھے کی سردی، یہ نظم نظیر کی جوانی کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یا اس کی جوانی کو آواز دیتی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں لمبی راتوں، کہنی چٹکی لاتوں، بوسوں، عیش و طرب، رنگین پوشاکوں اور نازک دو شالوں کا بھرپور ذکر ملتا ہے۔

جب ایسی سردی ہو اے دل تب روز مزے کی گھاتیں ہوں
کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
محبوب گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں
کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں۔ کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب سے پلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
ترکیب بنی ہو مجلس کی اور کافر ناچنے والے ہوں
منھ انکے چاند کے ٹکڑے ہوں تن روئی کے انکے گالے ہوں
پوشاکیں نازک رنگوں کی اور اوڑھے شال دو شالے ہیں
کچھ ناچ اور رنگ کی دعوتیں ہوں اور کچھ عیش میں ہم متوالے ہوں
پیالے ہے پیالہ چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

روٹی نامہ

روٹی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ ہم اسے شعر فلسفے اور دانش و حکمت کی باتوں میں بھول جائیں تو یہ ہماری اپنی بھول ہے۔ ورنہ بقول نظیر سارے نظام حیات کو روٹیاں ہیں چلا رہی ہیں۔ نظیر نے روٹی کو انسان کی معاشی ضروریات کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ روٹی نامہ میں نظیر نے ثابت کیا ہے کہ انسان سماجی حیوان تو ہوگا ہی مگر اس سے پہلے وہ معاشی حیوان ہے۔ اس غربت وافلاس کا موازنہ معاشی

خوشحالی و خورسندی سے بھی کیا ہے۔ جس کے پیٹ میں روٹیاں موجود ہوں۔ وہ دیواریں بھی پھاندتا ہے اچھل کود بھی کرتا ہے۔ ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی سے بھی دل بہلاتا ہے نظیر تو یہاں تک کہتا ہے

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

نظیر کا کامل فقیر آگے چل کر روٹی کے وصف بیان کرتے ہوئے روٹی کو کشف و کرامات کے درجے تک لے جاتا ہے

کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

پیٹ میں روٹی آتے ہی دل میں قند، آنکھوں میں گلزار اور ذہن میں بے شمار طبق کھل اٹھتے ہیں

چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید نکل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

حتیٰ کہ نظیر کے مطابق یاد خدا بھی روٹی کے بغیر ممکن نہیں ہے

بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

نظیر کا سماجی اور معاشی شعور اسی نظم میں قدم قدم پر بولتا محسوس ہوتا ہے۔ نظیر کے دور کے شاعر خود روٹی کے محتاج تھے اور ان کی ساری زندگی روٹی کے حصول میں سرگرداں رہی۔ مگر انہیں زندگی کی اس سب سے بڑی ضرورت اور اپنی سب سے بڑی مجبوری پر قلم اٹھانے کی توفیق نہ ہوئی۔ نظیر نے اس مجبور پابند دور میں روٹی کا ذکر کرکے اپنی ذہنی بلوغت کا پتہ دیا ہے اس دور کی شعری روایات روٹی کے براہ راست

ذکر کی متحمل نہیں ہوتی تھیں۔ اور اس کا ذکر کرنے والا بے ہنر اور بازاری خیال کیا جاتا۔ یہی الزامات نظیر پر بھی لگے۔ مگر اس نے نقدو شعر کے پنڈتوں سے ہٹ اور کٹ کر صرف عوام الناس اور ان کے احساسات سے علاقہ رکھا۔ اور نظم کو نہ صرف رواج دیا بلکہ اس کے ساتھ اسمیں ایسے موضوعات کو پیش کیا۔ جو زندگی اور اس کی بنیادوں سے مربوط تھے۔ وہ آسمانی ' مابعد الطبعیاتی اور غیر فطری باتیں کرنے والا آدمی نہ تھا۔ وہ زندگی اور زمیں کا بیٹا تھا۔ عوام کا دوست تھا۔ مخلص اور بے باک تھا۔ اور جو دل میں آیا لکھتا گیا۔ عوامی احساسات کی ترجمانی کرتا گیا۔ یہ نظم بھی نظیر کے انہی رویوں کی عکاس ہے۔

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں نور پور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی وموتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں
روٹی کااب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر
روکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہدوشیر
یا پتلی ہوئے موٹی خمیری ہو یا فطیر
گیہوں کی جوار باجرے کی جیسی ہے نظیر

ہم سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

بھونچال

یہ نظیر کی بڑی نظموں میں واحد نظم ہے جسمیں کسی خاص واقعے کو سامنے رکھ کر شعر کہے گئے۔ بھونچال زلزلے تو آتے رہتے ہیں کبھی ست کبھی تیز۔ مگر جس زلزلے کا نظیر نے ذکر کیا ہے وہ دن بدھ کا اور جمعرات کی آدھی رات تھی۔ سال تھا بارہ سو اٹھارہ مہینہ تھا اسلامی جمادی الاول کا اور تاریخ تھی سات۔ اسی تاریخی بھونچال کی منظر کشی نظیر نے اپنی اس نظم میں کی ہے۔ اس زلزلے نے غفلت زدوں کو مار کے ٹھوکر جگا دیا۔ اور ایک **لحظے** میں۔

دریا و کوہ و شہر و جنگل سب ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

زلزلے کا آنا تھا کہ انسان گھروں سے وحشی دشت سے اور طائر آشیانوں سے اچھل پڑے اور در بولے الحفیظ تو دیواریں پکاریں الحذر۔ منظر کشی ملاحظہ کریں

باہم کواڑ لڑ گئے زنجیریں ہل پڑیں
کڑیاں سرک سرک کے چھتوں سے نکل پڑیں
چھجے ستون کانپے منڈیریں دہل پڑیں
دیواریں جھوم جھوم کے پنکھے سے جھل پڑیں

گھر گھر غل مچ گیا۔ اللہ اللہ علی علی رام رام کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہر کوئی اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔ نظیر کہتا ہے کہ

اوروں کے دل کی کیا کہوں جانے وہی خدا
پر میں تو جانا سور سرافیل پھونک گیا

نظیر پھر اپنے مقصد کی طرف لوٹتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ رب جلیل کے سامنے جھک جاؤ

سجدہ کرو خدا کے تئیں یا رو دم بدم
آخر کریم تھا تو کیا اس نے پھر کرم
باقی تو کچھ رہی نہ تھی پر تھم گیا قدم
ورنہ گھڑی میں یارو نہ پھر تم تھے اور نہ ہم
حاکم وہی ' حکیم وہی حق وہی کبیر
خالق وہی 'خدا وہی ' دانا وہی خبیر
مالک وہی ملک وہی قادر وہی قدیر
قدرت کا اس کی ایک یہ شمہ تھا اے نظیر

مخمس میں لکھی گئی یہ نظیر کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ جسمیں کسی ایک مظاہر فطرت کی بھرپور لفظی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دوسری نظموں کے مقابلے میں اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں کسی خاص تاریخی واقعے کو نظم کیا گیا ہے۔ اس نظم میں نظیر خود بھی شامل نظر آتا ہے اور دوسری نظموں کے برعکس یہاں وہ اپنے ذاتی جذبات بھی صیغہ واحد متکلم میں بیان کرتا ہے۔ یہ نظم بھونچال کے دن کا ایک شخصی روزنامچے ہونے کے ساتھ ایک تازیانہ عبرت کا درجہ بھی رکھتا ہے نظیر نے اپنی وہی تکنیک پیش کی ہے۔ واقعہ ' منظر کشی' نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات' پھر سبق اور تلقین۔ نظیر اس نظم میں بھی حقیقت کے قریب ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر انسان پر خوف اور دہشت طاری ہو جاتی ہے یہی اس نظم کی کامیابی کی دلیل ہے

بھونچال کا جو حق نے یہ نقشہ دکھا دیا
قدرت کا اپنی زور جہاں کو دکھا دیا
روشن دلوں کے نور نظر کو بڑھا دیا

غفلت زدوں کا مار کے ٹھوکر جگا دیا
دریا و کوہ شہر و جنگل سب ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا
لرزے میں آکے ڈالیاں نخلوں کی ہل گئیں
دہشت سے چل بچل ہو جڑیں بھی کچل گئیں
تھرا کے گاؤ ماہی کی چولیں اوسل گئیں
جل تھل کے ہوش اڑ گئے ریخیں نکل گئیں
دریا و کوہ شہروجنگل سب ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جوانی اور بڑھاپے کی لڑائی

مخمس میں لکھی گئی یہ نظم ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ نظم ہے۔ جسمیں انسانی زندگی کی دو حالتوں یعنی جوانی اور بڑھاپے کا موازنہ کیا گیا ہے۔ مگر یہ موازنہ مقابلے کی صورت میں ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نظیر نے جوانی اور بڑھاپے دونوں کو متجسم و مشخص کرکے نظم کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک اکھاڑہ ہے جسمیں دو پہلوان خم ٹھونکتے ہوئے اترے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو بڑھ بڑھ کر للکار رہے ہیں۔ تماشہ گاہ میں چاروں طرف ہزاروں لوگ موجود ہیں کچھ اپنی عمر کی مناسبت سے جوانی کے حامی تو کچھ بڑھاپے کا کارن بڑھاپے کی طرف ہیں۔ منظر کشی ملاحظہ کریں

ہوئے ہیں دونوں جو لڑنے کے واسطے تیار

ادھر جوانی کھینچی ہے طیش سے تلوار
بڑھاپے نے بھی ادھر لاٹھی اک اٹھائی ہے

ادھر ہے تیر سا قامت تو ادھر پیٹھ کمان جوانی اپنے زور کے زعم میں رجز پڑھتی ہے

میں آج وہ ہوں کہ رستم کو کھڑکھڑا ڈالوں
پہاڑ ہووے تو اک دم میں ہل ہلا ڈالوں

بڑھاپا بھی اپنے دلائل میں کسی سے پیچھے نہیں ہے وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے

اگرچہ زور ہمارے نہیں ہے تن میں رہا
مسوڑوں سے ہی تیری ہڈیوں کو ڈالوں چبا
تو ہم بھی سوکھ کے جھر بیری کے ہوئے ہیں جھاڑ
ابھی کہے تو تیرے کپڑے لئے ڈالیں پھاڑ

جوانی پھر ترنگ میں آکر جواب آں غزل کے طور پر بول اٹھتی ہے

مرے تو واسطے عیش وطرب ہیں باغ و بہار
شراب وناچ مرے گل بدن گلے میں ہار
جدھر کو جاؤں ادھر عیش رنگ پھول اور پان
اچھل ہے کود ہے لذت مزے خوشی کے دھیان

بڑھاپا بھی پیچھے نہیں رہتا اور جواب دیتا ہے۔

شراب ہو جو پرانی تو اڑ چلے ہے نشا
پرانے جب ہوئے چاول تو ہے انھیں میں مزا
ہمیں ملی وہ بزرگی کی منزلت اس جا
کہ جب تلک ہیں رہے گی ہمارے ساتھ سدا

جب تکرار بڑھی۔ تو تکار بڑھی تو دونوں حریف ایک دوسرے سے گتھ گئے

بڑھاپا دوڑ جوانی سے وہیں آلپٹا
مروڑیں مونچھیں ادھر اس نے داڑھی کو کھینچا
جو بازو چھوڑتے تھے تو کمر پکڑتے تھے
ہر اک طرف سے نئے گھونسے لات جڑتے تھے

ہزاروں کے ہجوم میں یہ ناٹک ہو رہا تھا۔ جب مار کوٹ بہت بڑھ گئی تو پھر ایک نیا کردار ثالث کے طور پر سامنے آیا۔ یہ پہلوان ادھیڑپن نام رکھتا تھا۔ دونوں اسکی عزت کرتے تھے۔ اس نے دونوں کو سمجھا بجھا کر الگ کیا۔ اسطرح جوانی اور بڑھاپے میں صلح صفائی ہو گئی

یہ نظم بھی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اور زندگی کے بنیادی حقائق کو پیش کرتی ہے۔ اس نظم کا ڈرمائی عنصر اسکی دلچسپی میں اضافہ کر دیتا ہے چونکہ اسمیں لڑائی کا منظر پیش ہوا ہے۔ اس لئے لفظ مصرعے حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں

ادھر ہے تیر سا قامت ادھر وہ پیٹھ کمان
ادھر وہ ٹیڑھا بدن اور ادھر اکڑ کے نشاں
جوانی کہتی ہے بڑھ کر کہ سن بڑھاپے میاں
کہ تیری خیر اسی میں ہے چل سرک اس آن
وگرنہ تیری اجل میرے ہاتھ آئی ہے
کھڑے تھے لوگ ہزاروں یہ دونوں لڑتے تھے
گھڑی پچھاڑتے تھے اور گھڑی بچھڑتے تھے
جو بازو چھوڑتے تھے تو کمر پکڑتے تھے
ہر اک طرف سے نئے گھونسے لات جڑتے تھے
تو سب یہ کہتے تھے کیا ان کے جی میں آئی ہے
یہ مار کوٹ کا آپس میں جب ہوا چرچا

نظیر اس میں رہیں اک ادھیڑپن آیا
کچھ اس کو روکا ادھر اورکچھ اس کو سمجھایا
تم اپنے خوش رہو یہ اپنے خوش رہیں ہر جا
ملاپ خوب ہے لڑنے میں کیا بھلائی ہے

بنجارہ نامہ

بنجارہ نامہ نظم مخمس میں لکھی گئی ہے اور عبرت انگیزی کی ایک موثر مثال ہے اس نظم مین موت وفنا کے حوالے سے ایسی فضا قائم کی گئی ہے کہ جسے پڑھ کرانسان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور زندگی کی لا یعنیت منہ چڑاتی ہے۔ بنجارہ حرکت اور دولت کا نمائندہ ہے۔ نظیراس علامتی کردار سے مخاطب یہ کہ کہتا ہے کہ تو بہت بڑا لکھی کروڑی بنجارہ ہے۔ تیرا مال واسباب قیمتی اور کھیپ تیری بے پناہ بھاری ہے مگر یہ سب چیزیں موت اور فنا کے آگے بے معنی ہیں۔ سارا ٹھاٹھ باٹھ یہیں کا یہیں رہ جائے گا۔ جب زندگی کا بنجارہ سامان اٹھا کر چلا جائے گا۔ اس لئے وہ مشورہ دیتا ہے کہ

ٹک حرص وہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

موت ہروقت زندگی کے شکار کے لئے اسلحہ وآھن لئے تیار رہتی ہے۔ زندگی اتنی قلیل اور کمزور ہے کہ موت کاایک وار نہیں سہ سکتی۔ سارا مال دولت سازوسامان دوست رشتہ دار کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اورموت اپنے شکار کو لے جاتی ہے

قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گرادے گا
دھن دولت نانی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا

ہردم موت سے ڈرتا رہ کیونکہ

جب نائیک تن کا نکل گیا تو ملکوں ملکوں بانڈا ہے
پھر بانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوہ ہے نہ مانڈا ہے

نظیر موت کے منظر سے سہما کر لوگوں کو نیکیوں کی طرف راغب کرنا جاہتا ہے صدیوں سے استحصال کی چکی میں پسنے والے نظیری دور کے انسان بے حرکتی اور بے عملی میں ہی اپنی خیر جانتے تھے۔ وہ دور حرکت عمل نئی سوچوں اور نئے آفاق کا دور نہ تھا۔ ساری سوچیں زندگی اور اسکی چاردیواری کے اندر محدود تھیں۔ اس زندگی کی حفاظت اسی طرح ممکن تھی کہ کوئی حرکت نہ کی جائے۔ نظیر کا قصور نہیں ہے۔ یہ اس زمانے کی عام سوچ تھی۔ تخلیقی عمل ناپید اور ذہنی فرار عام تھا۔ زندگی ایک ڈھرے پر صدیوں سے چلتی آرہی تھی۔ اسمیں تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے نظیر بھی اسی سوچ کو آگے بڑھارہا ہے۔ اس فکری روش کے مطابق انسان جوگی درویش بن کر جنگلوں میں نکل جائے۔ یا اگر یہ نہ کرسکے تو چپ سادھ کر اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ جو ہونا ہے خود بخود ہو جائے۔ انسان ہاتھ پاؤں نہ ہلائے۔ کیونکہ ہاتھ پاؤں ہلانے کا بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور فائدہ نظر آئے بھی تو اس کا کیا فائدہ جب سب ٹھاٹھ پڑارہ جائے گا اور زندگی کا بنجارہ سارا سامان لاکر چلا جائے گا۔ نظیر کہتا ہے

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کا
سب ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دو شالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

بنجارہ نامہ نظیر کی مشہور نظموں میں سے ایک ہے اسکا ٹیپ کا مصرعہ تو اب ضرب المثل کا روپ اختیار کر گیا ہے نظیر نے زمانے کی مروجہ سوچ کے مطابق انسان دکھوں کی عکاسی کرتے ہوئے خاموشی بے حرکتی اور صوفیانہ استنکار ذات کو اپنانے کا مشورہ

دیا ہے۔ نظم کی تاثیر اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مندرجات اختلاف کے باوجود نظم کا بہاؤ پڑھنے والے کو ساتھ لا جاتے ہے

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کھپنی
یہ تھال کٹورے چاندی کے کیا پیتل کی دیبا دھپنی
کیا برتن سونے روپے کے کیا مٹی کی ہنڈیا چپنی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ
کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل زمرد سیم وزر
جب پونجی بات میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جان اوپر
نقارے نوبت بان نشاں دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا تکیہ مسند ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد پڑے گا بنجارہ

ہنس نامہ

نظیر کی یہ نظم کچھ عجیب قسم کی نیم رومانی نظم ہے جسمیں ایک ہنس کی کہانی بڑے دلاویز پیرائے میں بیان کی گئی کہے۔ یہ نظم خالص ترنگ کی کیفیت کی مظہر ہے۔ نظیر کا کہنا ہے کہ دنیا کی الفت کا اسے جو سہارا ملا اور اسے ایک خاص طرح کی خود فراموشانہ مسرت نے اپنی گرفت میں لیا۔ تو اسی عالم غفلت میں اسکے چشم تصور نے ایک خواب دیکھنا شروع کیا۔ اس کیفیت میں اسے ایک ہنس کی یاد آنے لگتی ہے جو کسی دور دیس سے نظیر کے شہر میں آگیا تھا اور ایک ایسے پیڑ پر ٹھکانہ بنالیا تھا جہاں انواع انواع کے پرندوں نے پہلے سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اب یہاں سے نظیر کی

جانوروں او پرندوں کے بارے میں قوت مشاہدہ ومطالعہ کا کمال سامنے آنے لگتا ہے۔
انہوں نے پرندوں کی کون سی قسم ہوگی جسکا نام نہیں گنوایا ہوگا بعض پرندے تو ایسے
ہیں جنکا نام بھی عام قاری نے کبھی نہیں سنا ہوگا۔ ذرا فہرست پرندگان ملاحظہ ہو
" چنڈول اگن ابلقے جھپاں منیا بئے بگلے کلکلے طوطے بلبل کوئل کھنجس گلنکو سیمرغ
گڑھ پنکھ ساس باز لگڑ جرہ شاھین شکرے ٹرنکے ٹنٹنی بزے پندخی ٹوٹر قمری ہریوے
غوغائی بگیری لٹورے پپیے لال چڑے پودے پدے پدڑی بٹیر تیتر کبک تدرک ہدہد زاغ
زغن طاؤس کبوتر شام چڑی جھانپو ہریل "
چنانچہ ہنس نے پیڑ کے باسیوں کے ساتھ اپنا رشتہ محبت استوار کرلیا۔ پرندے بھی
اسے دل وجان سے چاھنے لگے۔ اسی عالم مین دو چار مہینے گزر گئے پھریکایک ایک دن
ہنس نے سب دوستوں کہا کہ اب مجھے اجازت دو میں تو اپنے وطن سدھاروں۔ یہ بات
سنتے ہی چاہے والے پرندوں پر غش پڑنے لگے چنانچہ سب نے متفقہ طوراعلان کیا کہ وہ
بھی ساتھ چلیں گے۔

ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا

سب پرندے ہنس کے سنگ سنگ ہولئے مگر اکثر پرندے تو اتنے بڑے پرواز گزار نہیں
تھے چنانچہ تھک تھک کے ہر مقام پر دو چار گرنے لگے۔ کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ
کوس اڑا کوئی یہاں گرا کوئی وہاں

چیلیں رہیں کوے گرے اور باز بھی تھک کے
اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

سب کہانی بیان کرنے کے بعد نظیر کچھ عجیب وغریب نتیجہ اخذ کرتا ہے

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیونکر ہو نبھاہ

ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجئے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیرآہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

یہ نظم نظیر کی زبان دانی پر دال ہے۔ ہنس گویا علامت ہے دنیا اور اسکی اشیا کی پرندے دنیا کی مخلوق کی ترجمانی کرتے ہیں پرندے راج ہنس سے دل لگا لیتے ہیں۔ اور اس کے پیچھے چلتے ہیں مگر کم حوصلگی کی وجہ سے راہ ہی میں کھیت ہوجاتے ہیں۔ راج ہنس ایک اور معنوں میں محبت اور اعلیٰ نصب العین کا استعارہ بھی بنتا ہے۔ نظیر کہنا چاہتا ہے کہ محبت جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور یہ ہر ایرے غیرے کے نصیب اور بس کی بات بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے دل میں عزم جواں کے ساتھ بازوؤں اور پروں میں طاقت پرواز بھی ہونی چاہیئے جو لوگ محبت تو کرتے ہیں مگر محبت کے حجم کے مطابق طاقت وتوانائی نہیں رکھتے تو وہ ان تھکے ہارے پرندوں کی مانند ہیں جو بے بسی کے عالم میں ادھر ادھر گرتے رہتے ہیں

بہرکیف نظیر کی یہ مخمس ایک دلچسپ رواں دواں ہلکی پھلکی نظم ہے جسے پڑھ کر نظیر کے نظریہ فن قدرت کلام اور فنی چابکدستی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مئے
سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کی بڑی شے
جب ہوگئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے
چیلیں رہیں کوے گرے اور باز بھی تھک کے
اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

اور ہنس کی واں سب کو رفاقت ہوئی غالب
جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب

دو کوس اڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

خطوط غالب

نجی خطوط ہر شخص کی ذات کا ایک آئینہ ہوتے ہیں جس میں اس شخص کی زندگی اس کے باطن و خارج اور دل دو ماغ کے خدوخال بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ خط بھی چہرے کی طرح دل کا انڈکس ہوتا ہے مگر بعض لوگ ذات کی اس تصویر پر اس قدر ملمع چڑھا دیتے ہیں کہ حقیقت کا رنگ دھندلا جاتا ہے خط اشتہار نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی خفیہ تحریر ہوتا ہے جسے دوسروں کی نظروں سے چھپایا جاتا ہے۔ اسی لئے دوسروں کے خطوط پڑھنا بدترین اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے مہذب ملکوں کے آئین میں شخص کی اس امانت کو تحفظ دیا گیا ہے۔ خطوط چھپنے چھپانے کے لئے نہیں ہوتے۔ خطوط ہاتھ سے نکلنے کے بعد مکتوب نگار کی ملکیت نہیں رہتے بلکہ وصول کرنے والے کی ملکیت بن جاتے ہیں پھر وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال میں لاسکتا ہے۔ مکتوب نگاری کی تاریخ بھی اسی قدر پرانی ہے جس قدر قلم اور تحریر کی تاریخ ہے۔ ہر دور میں خطوط لکھے گئے بادشاہوں گداؤں بزرگوں غلاموں مردوں عورتوں سبھوں نے خطوط لکھے۔ خطوں نے حکومتوں کے تختے بھی الٹے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو بھی جوڑا۔

انسانوں کی طرح خطوں کی بھی ہزاروں قسمیں ہیں اچھے خط برے خط لمبے خط مختصر خط محبت بھرے خط نفرت بھرے خط بامروت غصیلے کٹیلے چٹخارے دار بدمزہ غرض انواع نواع کے خط اور بھانت بھانت کی بولیاں۔ دوسرے لوگوں کی طرح ادیبوں اور شاعروں نے بھی خط لکھے مگر ضروری نہیں کہ بڑے فنکار اچھے مکتوب نگار بھی ہوں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے انتہائی پھس پھسے اور غیر ادبی خطوط لکھے جنہیں زمانے نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ ان بڑے ادیبوں کے خطوط یا تو بد ذوق لوگوں کے ہاتھ چڑھے اور انہوں نے انہیں تلف کردیا یا پھر ان میں کوئی بات ہی ایسی نہ تھی کہ وہ باقی رہتے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خطوط باقی نہیں رہے اور جن کے باقی رہے ان کی اہمیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہو۔ البتہ بعض ادیبوں شاعروں نے دنیائے ادب کو خطوط کی صورت میں ایسا خزینہ عطا کیا ہے جو رہتی دنیا تک ہمیشہ یادگار رہے گا

انگریزی ادب میں چارلس لیمب اور کیٹس کے خطوط کو ادب کا حصہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح اردو ادب میں غالب نے ہی خط کو صنف ادب بنایا اور اس کو اعلی ترین مقام تک لے گئے غالب بلاشبہ اردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ بڑا شاعر مکتوب نگار بھی ہو۔ غالب کے خطوط ادب کا ایک معجزہ ہیں۔ غالب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کے خطوط اس طرح کتابی صورت میں چھاپے جائیں گے وہ تو بس خط لکھتے تھے اور خوب لکھتے

تھے اور بہت لکھتے تھے۔

غالب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ہر شخصیت کی تکمیل مختلف عوامل سے ہوتی ہے جن میں موروثی خصوصیات عمرانی سماجی سیاسی حالات، ناکامیاں نامرادیاں، تعلیم و تربیت سب مل کر تانا بانا بنتی ہیں۔ غالب ترکمان ایبک تھے۔ ان کا سلسلہ کئی واسطوں سے فریدون جمجاہ تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ وہی فطری خود بینی تفاخر اور انفرادیت ان کی شخصیت کے تیکھے رنگ ہیں۔ ظرافت فطرت کی طرف سے ودیعت تھی۔ زمانہ ناساگار اور ماحول نامساعدان کی کبھی نہ مطمئن ہونے والی فطرت اس پر مستزاد چنانچہ جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس قدر بو قلموں اور جامع ہے کہ غالب کا ثانی ملنا ممکن نہیں ہے۔ غالب اپنے آپ پر بھی خندہ استہزا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ غالب اپنی تحریر میں ایک استاد بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کی تحریر میں زندگی کی حرارت اور توانائی ہے۔

جو خط غالب نے لکھے ان کا ادب میں ممتاز ترین مقام ہے۔ غالب اگر خطوط کے سوا اور کچھ نہ بھی لکھتے تب بھی شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں نمایاں مقام پاتے۔ مگر غالب خطوط لکھتے لکھتے نئی زبان نئی نثر اور نئے اسلوب کا ڈول بھی ڈال گئے جو درحقیقت ان کی بہت بڑی دین ہے۔ اسی لحاظ سے وہ بعض نقاد ان فن کے نزدیک جدید اردو نثر کے بانی بھی ٹھہرتے ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو مشکل پسندی' قافیہ بندی' ترصیع نگاری اور شعری سانچے سے نکال کر اسے صحیح معنوں میں سادہ سلیس قابل فہم اور ادبی نثر بنا دیا۔ بعض

لوگ نثر کی خدمات کے سلسلے میں غالب کو سرسید سے بڑا مقام دیتے ہیں جو درحقیقت درست نہیں۔ بااین ہمہ یہ طے ہے کہ غالب نے اردو نثر کو جدیدیت کی راہ پر ضرور ڈال دیا جسے بعد میں سرسید اور ان کے رفقاء نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے برتا اور ادب کے دامن کو اپنی گرانمایہ تصانیف سے مالا مال کیا۔

غالب اپنی جدت طراز فطرت کے باعث رجب علی بیگ سرور، فقیر محمد گویا اور سرسید کی آثار الصنا دید والی نثر کو مسترد کرکے زبان دبیان کے نئے سانچے اور نئے اسلوب وضع کر کے اردو نثر کو ایسی راہوں پر ڈال گئے جن پر چل کر اردو زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہونے کی دعویدار بن گئی۔ غالب سے پہلے فورٹ ولیم کالج میں نثر کو سادہ بنانے کی شعوری کوششیں کی گئیں اور میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، للو لال جی، ڈاکٹر گل کرائسٹ اور دوسرے ادیبوں نے اردو نثر کو معرب و مفرس گنجلک مقفعی مسجع شعری روایتوں کی بھول . بھلیوں سے نکالنے کی سعی کی اور باغ و بہار جیسی شاہکار نثری تصانیف ۱۸۰۰ کے لگ بھگ منظر عام پر آگئیں مگر یہ شعوری کوششیں ایک تعلیمی و تحقیقی ادارے تک ہی محدود رہیں اور نثر کی عمومی روش پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر بے شک سادہ و سلیس اور عام فہم ہے۔ وہ اپنے زمانے کی نثر سے بہت مختلف ہے ایک ایسے دور جس میں سارے اردو ادب کا سرمایہ دہ مجلس تحسین کی نوطرز مرصع اور چند مذہبی

رسائل کے سوا کچھ نہ تھا۔ فروٹ ولیم کالج کا وجود اردو زبان و ادب کے لئے ابر رحمت سے کم نہ تھا مگر افسوس کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر کالج سے باہر نہ نکل سکی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب فارسی زبان و بیان کے شکنجے میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ سہ نثر ظہوری اس وقت کے شعرا و ادبا کے لئے معیاری تحریر تھی۔ چنانچہ اس کی تقلید ہی معیار ادب تھا یہی وجہ ہے کہ تحسین کی نو طرز مرصع اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے یہ دور خالص شاعری کا دور تھا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ شاعری کے غلبے کے دوران نثر پر بھی شاعری کا رنگ چڑھتا ہے یہی حال اس دور کی نثر کا ہے۔ پھر ایک بات یہ ہے کہ اس دور کے ادیبوں کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ قصے کہانیاں داستانیں تمثیلی قصے' بادشاہوں شہزادوں محلوں جنوں پریوں کی محیرالعقول کہانیوں کے لئے وہی خواب آگیں مسحور کن بھاری بھرکم رومانوی زبان ہی موزوں سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت کوئی اجتماعی شعور بھی نہ تھا۔ ہمارے ادبا کے مخاطب خواص تھے جو پڑھے لکھے تھے اس لئے جاگیردارانہ ماحول میں یہی زبان سکہ رائج الوقت تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر فورٹ ولیم کالج کا تجربہ روایت نہ بن سکا یہ وہ کنواں تھا جو ندی نہ بن سکا اور اپنے اندر ہی تاریخ کے تجربوں کو لے کر سو گیا۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر نثر اسی ڈگر پر چل رہی تھی۔ رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب (۱۸۲۴) اسی رنگ کی آئینہ دار ہے۔ فقیر محمد گویا کی

تحریریں اور حتیٰ کہ سرسید احمد کی آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن (۱۸۴۵) کی زبان مروجہ روش کی منشیانہ نثر سے مختلف نہیں جو مشکل پسندی، لفظی صنعت گری، قافیہ پیمائی، تشبیہ استعارہ و تمثیل سے عبارت تھی۔ سرسید جو قدیم زمانے کے سب سے جدید انسان تھے اس وقت تک اس گھورکھ دھندے سے باہر نہیں نکل سکے۔ غالب بھی شاید اس بھنور سے باہر نہ نکل سکے مگر ان کی منفرد طبیعت اور جدت پسندی نے ان کو پرانی راہوں سے الگ اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ شاعری میں تو غزل کو بقدر ظرف تنگنائے سمجھتے ہوئے بیان کی نئی وسعتیں تلاش کرنے کا اعلان کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ نثر میں بیان کی نئی وسعتیں تلاش کر گئے۔ غالب کی فطرت کی کلید ان کی خود پسندی اور جدت طرازی ہے۔ وہ گھسی پٹی راہوں پر چلنے کے قائل نہ تھے نہ وہ عام دبا میں مرنا پسند کرتے تھے نہ عام لوگوں کی روش اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ غالب نے اپنے فطری رجحان اور فلسفیانہ مزاج کی وجہ سے شعر و نثر دونوں میں ابتدا" مشکل پسندی اختیار کی اور ایسی اختیار کی کہ لوگ سر پیٹتے رہ گئے مگر کسی کے پلے کچھ نہ پڑا اور لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے

غالب کو خط لکھنے کا شوق ہی نہیں عشق تھا۔ وہ آم کھاتے یا خط لکھتے تھے خط لکھنے کے موضوع پر ان کی شاعری میں بیسیوں دلچسپ اشعار بھی ملتے ہیں۔ خطوط کے بارے میں اس سے اچھے شعر شاید اردو کے کسی شاعر کے نہ ملتے ہوں گے فرماتے ہیں

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

آنکھ کی تصویر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
کھل جائے تم پہ کہ ہم کو حسرت دیدار بھی ہے

خط کوئی تم کو لکھوائے تو ہم سے لکھوائے
صبح ہوئی اور کان پر دھر کر قلم نکلے

خطوط غالب کے کئی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں کچھ نئی دریافتیں بھی ہو رہی ہیں۔ انہوں نے اردو میں ایک ہزار سے اوپر خط لکھے جو تقریباً اتنے ہی صفحات پر محیط ہیں جو بذات خود ایک ضخیم تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غالب کو خطوط نویسی سے خاص لگن تھی جنگ آزادی کے دوران' اس کے بعد اور بیماری کے ایام میں تو ان کا خطوط نویسی کے علاوہ اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ خود نہ لکھ سکتے تو دوسروں سے لکھواتے۔ پرانے اسلوب کے خطوط میں القاب و آداب اس قدر ہوتے تھے کہ مکتوب الیہ پر داستانوں کے ہیرو کی طرح انسان ہونے کا اطلاق مشکل سے ہوتا تھا۔ سب ہی خطوط صرف ناموں کے فرق سے ایک دوسرے کے مشابہ

تھے۔ ان کو آج کل کے چھپے ہوئے دعوت ناموں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو صرف نام بدلنے سے ہر شخص کے نام بھیجے جاسکتے ہیں۔ یہ خطوط سہ نثر ظہوری نو طرز مرصع اور فسانہ عجائب کی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو پڑھنا محال اور سمجھنا مشکل تر تھا۔ ظرافت و خوش طبعی کا توان خطوط میں دور دور تک نشان نہیں ملتا تھا۔ بے تکلف دوستوں کے خطوط پڑھ کریوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک علامہ دوسرے علامہ کو علمی نکات سمجھا رہا ہو۔ ان خطوط میں انفرادی شخصیت اور ذات ملمع اور تصنع کے سو پردوں کے پیچھے گم ہوگئی تھی۔ خط لکھنے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے منشی ہونا ضروری تھا۔ غالب نے اس فرسودہ اسلوب کے خلاف یکسر بغاوت کردی۔

غالب نے سب سے پہلے ان گھسے پٹے طویل القاب و آداب کو خیرباد کہا اور ان کی جگہ ہر مکتوب الیہ کے حسب حال اور ان ناموں سے جن سے وہ عام روزمرہ زندگی میں ان کو مخاطب کرتے تھے مخاطب کرنا شروع کیا۔ دام اقبالہ 'نور چشمی' طول العمر' کی جگہ غالب کے خطوط میں مہاراج سیٹھ برخوردار عزیز من وغیرہ کے ہلکے پھلکے زندگی سے معمور الفاظ سے خطوط کا آغاز ہوتا ہے جن میں خلوص کی گرمی جھلکتی ہے

غالب کے خطوط کی ایک اور بڑی خصوصیت ان کی ظرافت و مزاح ہے۔ غالب حیوان ظریف تھے مزاح اور خوشی طبعی ان کے لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ خالص مزاح کا یہ رنگ ان سے پہلے کسی اور اردو ادیب کے ہاں

نہیں ملتا۔ وہ پہلے اردو مزاح نگار کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ غالب ہنستے ہنسانے گد گدی کرنے چٹکی لینے چوٹ کرنے اور بات سے بات نکالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ دوسروں سے لکھواتے اور لطف اٹھاتے۔ ان کے کثیر الاحباب ہونے سے بھی انکار نہیں۔ ان میں بڑے لوگ امرا وزراء والیان ریاست بھی شامل تھے۔ عام دوست میر مہدی مجروح منشی ہر گوپال بنی بخش حقیر وغیرہ بھی ان کے مکتوب الیہ ہیں۔ بڑے لوگوں کے نام لکھے ہوئے مکاتیب میں کچھ رسمی اور کسی حد تک منشیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ مگر عام دوستوں شاگردوں اور عزیزوں کے نام لکھے ہوئے خطوط کی خصوصیات دوسری ہیں۔

غالب کو اپنے خطوط کی خصوصیات کا خود بھی علم تھا چنانچہ انہوں نے بعض خطوط میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ میں نے خط کو مکالمہ بنادیا ہے۔ کوسوں کی مسافت کو ختم کردیا ہے خط لکھو اور فراق میں وصال کے مزے لوٹو۔ سچ ہے غالب کے خط نصف ملاقات نہیں پوری ملاقت کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ محفل کا رنگ لئے ہوتے ہیں۔ خطوط غالب کی خصوصیات گنوانے سے قبل اس زمانے کی عام خطوط نویسی کے رجحانات کو دیکھنا چاہیے۔ غالب سہل پسندی کی طرف راغب ہوئے تو سب کو مات دے کر نئی نثر اور نئے اسلوب کے پیشرو قرار پائے۔ غالب نے مروجہ روش سے ہٹ کر نثر کو لوازمات شعری کے حبس بے جا سے نکالا اور اس کو سادگی و سلاست کے

تاروں بھرے آسمان کے نیچے چاندنی کی ٹھنڈک بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔
غالب کی نثر کا بیشتر حصہ مکاتیب کی شکل میں ہے مگران مکاتیب کے اندر بھی
غالب نے معانی و مفاہم کی پوری دنیا آباد کردی ہے

فلسفہ مذہب شعر و ادب 'تاریخ 'سماجیات 'سوانح 'تنقید اور دوسرے
موضوعات مفصل مباحث ان کے خطوط میں ملتے ہیں۔ غالب خطوط کے اندر
ادب تخلیق کررہے تھے۔ مگر انہیں اس کا پتہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں
برجستگی روانی فطری انداز چہلیں لطیفے مزاکرے مباحثے گلے شکوے سب کچھ مل
جاتا ہے۔ غالب کی نثر بیک وقت شیریں بھی ہی نمکین بھی ہے اور پر تمکین
بھی۔ اس میں غالب کی شخصیت کے سارے رنگ کھل کر سامنے آگئے ہیں
اور غالب خوبصورت نثر کے صاحب طرز ادیب کی صورت میں تاریخ کے
صفحات پر ممتاز ترین مقام کے حامل بن کر ابھرے۔

ان کی نثر عالی ظرفی، شستگی، فکرانگیزی کے ساتھ ' ادبی و شاعرانہ حسن
لئے ہوئے تھی۔ ان کے ہاں پھکڑ ابتذال یا سوقیانہ پن کی کوئی مثال نہیں ملتی
۔ ان کی ظرافت چہرے پر شگفتگی اور تازگی بکھیرنے سے عبارت ہے اور خندہ ء
دندان نما سے آگے آگے نہیں بڑھتی ۔ وہ مردمیدان تھے کسی بھی صورت حال
کے آگے ہتھیار ڈالنا انہوں نے نہیں سیکھا تھا۔ وہ ہر صورت حال کا مقابلہ
ظرافت کے بے ضرر مگر کارگر ہتھیار سے کرتے ہیں۔ ان کے تعزیت نامے
تک اسی ظرافت کے آئینہ دار ہیں یوسف مرزا کے والد کی وفات پر یوں تعزیت

کرتے ہیں۔

پہلے تمارا بیٹا مرا۔ اب باپ مرا ہے کوئی مجھ سے
پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا
کہ یوسف مرزا کو

غالب کے خطوط کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف لکھنے والے کی پوری شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ بلکہ مکتوب الیہ کی شخصیت بھی پردوں سے باہر آجاتی ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں نفرت غصہ محبت عداوت زمانے کی ناسازگاری اور مئے نوشی تک کی تفصیلات ہمیں خطوط سے مل جاتی ہیں ۔ غالب کے خطوط سے غالب کی سوانح حیات بڑی آسانی کے ساتھ مرتب ہوسکتی ہے۔ میر کی شاعری اگر ان کے درد و غم کا دیوان ہے تو غالب کے خطوط ان کی داستان حیات ہیں اور یہی ان کی عظمت کو دلیل ہے

غالب نے اپنے خطوط میں مکالموں سے بھرپور کام لیا ہے اور اس سے اپنے مکاتیب میں ڈرامائیت پیدا کی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں اس کے خطوط چلتے پھرتے مرقعے بن جاتے ہیں

کہو بھائی لوہارو سے سواریاں آئیں
ابھی کہاں حضور
کہو میرن آج اجازت ہے مہدی کو خط لکھنے کی۔ یا

اجی حضور نے میں نے کب منع کیا تھا وغیرہ وغیرہ

نذیر احمد کو مکالمہ نگاری کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ مگر ادبی مکالمے لکھنے کی شمع غالب نے روشن کی تھی۔ پھر بغیر متکلم مکالمے لکھنے کا شعور تو آج پیدا ہو رہا ہے ۔ نذیر احمد بھی بغیر متکلم مکالمے لکھنے پر قدرت نہ رکھتے تھے مگر غالب کے ہاں بغیر متکلم مکالمے لکھنے کا رنگ اسی وقت سے موجود تھا علاوہ ازیں نذیر احمد کے مکالموں میں ظرافت اور نکتہ آفرینی کا وہ رنگ کہاں ہے جو غالب کے اکثر مکالموں میں ملتا ہے

غالب کے خطوط جنگ آزادی کے بعد کے مصائب کی ایک دلچسپ تاریخ بھی ہیں جن مصائب و آلام سے اہل دہلی اور خصوصاً" مسلمان گزرے تھے غالب نے غزل کی ایمائیت واشاریت سے کام لے کر فنکارانہ چابک دستی کیساتھ ان کو رقم کیا۔ اس زمانے میں خطوط پر سنسر بھی تھا۔ چنانچہ غالب نے سنسر کی آنکھ سے بچتے ہوئے حالات کو تحریر کیا ہے

غالب کے خطوط نے اس زمانے کی کئی علمی ادبی ہستیوں اور ان کے کم مشہور دوستوں کو جیتی جاگتی ہستیوں کی صورت میں ادب کے صفحات پر زندہ بنا دیا ہے۔ یہ کردار ادب کے چند بلند پایہ کرداروں کی طرح اذہان پر نقش رہیں گے

غالب کے خطوط میں جو ادبی مباحث موجود ہیں ان کے ذریعے غالب کے ادبی ذوق کا پورا پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ مباحث عملی تنقید کے عمدہ نمونے بھی

ہیں۔ ان کو یک جا کرنے سے اعلی ادبی تنقید کے نمونے حاصل کیے جاسکتے ہیں ۔ بہرکیف خطوط غالب اردو ادب زبان نثر تاریخ کا ایک لازوال سرمایہ ہیں جن کے آئینے میں غالب کی شخصیت فن اور زمانے کے حالات و واقعات کا بخوبی مطالعہ کیا جاسکتا ہے غالب کی شاعری کی طرح یہ خطوط بھی لازوال علمی و ادبی سرمایہ ہیں جن کو وقت کی دھند کبھی نہیں مٹا سکتی۔

غالب کی شاعری

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے اور غالب کہتے کہ کوئی بتلاؤ کہ بتلائیں کیا۔ غالب کو زندگی بھر زمانے سے گلہ رہا۔ غالب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ زمانے نے ان کو کس قدر یاد رکھا ہے۔ اور ان کی یاد کہاں کہاں منائی جا رہی ہے۔ غالب پر اس قدر کام ہوا ہے کہ لائبریراں بھری پڑی ہیں۔ مگر غالب اپنی زندگی میں بے قدری اور بے مہری کا خوب شکار ہوئے۔ زمانے نے ان کو طرح طرح سے ستایا اور رلایا۔ مگر غالب بڑی ثابت قدمی سے گردش افلاک کی نیرنگیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور اپنی انفرادیت کی شمع روشن کئے آلام و ابتلا کی گھڑیاں بتاتے رہے۔ غالب اپنے زمانے میں بھی کم مشہور نہ تھے۔ اعلیٰ ترین حلقوں تک ان کی رسائی تھی۔ بادشاہ کی مصاحبت اور استادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ نام بھی بہت کمایا۔ شعر و سخن کی سلطنت پر سریر آرا بھی ہوئے مگر معاشی بدحالی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ عمر بھر پنشن وظیفوں کے چکر میں گرفتار رہے۔ اجراء بندش کی دھوپ چھاؤں جاری رہی۔ کلکتے کے سفر اور ملکہ برطانیہ کے قصیدے تک نوبت پہنچی۔ نوکری کی تلاش بھی ہوئی اور جیل کی ہوا بھی کھائی

پڑی۔

آبا کا پیشہ سپہ گری تھا۔ عمر بھر اس پر نازاں بھی رہے۔ شاعری کو ذریعہ افتخار نہیں سمجھا۔ گو شاعری نے ان کو بہت کچھ دیا۔ غالب فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ فارسی کے مقابلے میں اپنی اردو شاعری کو بے رنگ سمجھتے تھے۔ مگر آج وہ اپنی اردو شاعری کی وجہ سے ہر دلعزیزی کے بلند ترین مقام پر ہیں۔ میر تقی میر کو بجا طور پر خدائے سخن کہا جاتا ہے مگر غالب نے غزل کو ایک نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا اور بعض لوگوں کو نگاہ میں اور اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت میں کلام نہیں۔ بہت کم ایسے شاعر ہوں گے جو اس قدر کم اشعار کے باوجود عظمت کے اس مقام پر فائز ہوں۔ غالب کا اردو کلام حجم میں انتہائی مختصر ہے مگر معنوی وزن و وقر کے لحاظ سے بڑے بڑے شعرا کے ضخیم دواوین پر بھاری ہے۔

غالب کی شاعری کے بارے میں بڑی بڑی دلچسپی آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ عبد الرحمٰن بجنوری دیوان غالب کو الہامی کتاب تصور کرتے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر عبد الطیف کو غالب کے شاعر ماننے ہی میں تامل تھا در حقیقت غالب کی شاعری جام جہاں نما ہے۔ جس میں مئے نوش کو اپنی دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔ غالب اردو شاعری کے تاج محل ہیں جو اپنی انفرادیت' قدر و قیمت اور حسن و جمال کی وجہ سے ہمیشہ دنیائے ادب میں تابندہ رہیں گے۔ غالب منفرد اور جدت پسند ذہن کے مالک تھی۔ زمانے سے الگ اور انوکھا راستہ نکالنا ان

کی خصوصیت تھی۔ اگر لوگ سادہ گوئی کی طرف مائل ہوں۔ تو غالب مشکل پسندی کی طرف راغب ہوں گے۔ اور اگر زمانہ مشکل پسندی کو پسند کرنے لگے تو غالب سہل ممتنع لکھنے لگیں گے۔ غالب نے مشکل اور آسان دونوں قسم کے شعر کہے ہیں۔ مشکل گوئی کی تو ایسی کہ آج تک ان کے اشعار کے مطالب فہم کی گرفت میں نہیں آرہے۔

ے

زبان میر سمجھے زبان میرزا سمجھے
ان کا کہا یہ خود سمجھیں یا خدا سمجھے

آسان شعر کہے تو اس درجے کے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

غالب بہت بڑے ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ وہ تلمیذ الرحمٰن تمے۔ ملا عبد الصمد کی شاگردی کے دعوے کے باوجود یہ حقیقت ہے۔ وہ نابغہ تھے۔ جن کو کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ غالب اپنے زمانے سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے اسی لئے ان کے معاصران کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کا ذہن رسا فکر و خیال کے ان میدانوں میں بھی پہنچ جاتا تھا۔ جہاں تک دوسرے لوگوں کے ذہن نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ تنگنائے غزل سے باہر نہ نکل سکے۔ مگر انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ

غزل ان کے ظرف خیال سے بہت چھوٹی چیز ہے۔ وہ اپنے بیان کی مزید وسعت کے متلاشی تھے۔ وہ مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کی علامتوں کے حوالے سے کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

غالب کی شخصیت کی کنجی جدت پسندی ہے۔ غالب خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگردان نظر آتے ہیں۔ نئے مضامین' نئے رنگ' نئے مفاہیم ان کے ہاں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ان کا کلام ایک جہاں معنی ہے۔ ایک بحرنا پیدا کنار ہے۔ جس میں ہر شخص کو اپنے ظرف و ذہن کے مطابق گنج ہائے گرانمایہ مل جاتے ہیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا یہ بھی گویا میرے دل میں ہے

غالب ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے دنیا کے نشیب و فراز سے درس آگہی حاصل کیا تھا۔ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب دیکھا تھا۔ اور ان کو شعروں کی سچائی میں گوندھ کر پیش کیا ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کا نکتہ نظر جذباتی اور شاعرانہ نہیں۔ بلکہ حقیقت پسندانہ اور عالمگیر ہے ان کی شاعری میں غم' دکھ' پریشانیاں' خوشیاں' مسرتیں' قہقہے سب کچھ ملتا ہے۔ انہوں نے حالات سے پنجہ آزمائی کا درس دیا۔ وہ انسان کو محض انسان کو نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کو وقت کے ساتھ چلنے اور مقابلہ کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو اپنی داستان حیات بھی کہتے ہیں جس میں ان

کی شکستہ آرزوؤں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

نے گل نغمہ ہوں نے پردہ ساز
میں ہوں اپنی ہے شکست کی آواز

غالب زندگی کے مصائب و آلام کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں۔ سپر اندازی کا انداز کسی جگہ نہیں۔ فرار کسی جگہ نہیں۔ وہ زمانے کی مشکلات کے مقابلے میں اپنے ظرف، قوت، اور مدافعانہ برتری کا اظہار کرتے ہیں۔

زمانہ سخت کم آزار تھا بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

غالب کی عالی حوصلگی اور عالی ظرفی کا اظہار دوسری جگہوں پر بھی بڑے لطیف، دلچسپ اور شاعرانہ انداز میں ہوا ہے۔ جو غالب کی رفعت ذہنی اور فکر رسا کا مظہر ہے۔ فرماتے ہیں۔

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالب حوصلہ مندی کے ساتھ زندگی کی رگوں سے رس نچوڑ لینے کا یقین رکھتے تھے۔ ان کی امنگیں جوان تھیں۔ حوصلہ برنا تھا۔ ذہن زرخیز تھا۔ دل شاداب تھا فکر رسا تھا۔ خیالات رفیع تھے۔ ہوش وقیع تھے۔ آگہی تابندہ تھی۔ ادراک

رعنا تھا۔ غالب ہوشیار۔ زیرک اور بیدار مغز انسان تھے۔ وہ دنیا کو بازیچہ اطفال سمجھتے تھے۔ اور شب و روز کے اس تماشے کی حقیقت سے آگاہ تھے۔ آخری دور کی ایک غزل بھی بڑی عمدگی کے ساتھ ان خیالات کو شعر کے خوب صورت سانچے میں ڈھالا ہے۔ غالب کی یہ غزل ان کی شخصیت و فن کو سمجھنے کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے میرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے
ایماں مجھے رو کے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

غالب کی شاعری خالص انسانی شاعری ہے۔ اور اس لحاظ سے آفاقی قدروں کی حامل ہے۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ ہر دور اور خطے کے لئے ہے۔ ان کے ہاں آلام حیات اور نشاط حیات دونوں کا متناسب تجربہ ملتاہے۔ افراط و تفریط نہیں ہے۔ تصنع و بناوٹ کے پردے نہیں ہیں۔ فلسفیانہ قنوطیت و رجائیت نہیں ہے۔ غم و انبساط دونوں میں حقیقت کا رنگ جھلکتا

ہے۔ غالب کی شاعری منہ بسورتی اور آنسو ٹپکاتی بے بسی کی تصویر نہیں ہے۔ غالب زندگی کو خانوں میں بانٹنے کے قائل نہ تھے۔ وہ زندگی کی کلی طور پر تمام تر رعنائیوں و رسوائیوں سمیت قبول کرنے کے قائل تھے۔ وہ گل پرست تھے۔ نہ خاربدست بلکہ وہ گلشن پرست تھے۔ انہیں گل بھی عزیز تھے اور خار بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی سے اپنا خراج ضرور وصول کرنا چاہیے۔ خوشیوں کے موقع پر جی کھول کر خوش ہونا چاہیے۔ اور زخم لگنے پر خوب دل کھول کر رونا چاہیے۔ رونا اور ہنسنا دونوں ہی زندگی کی علامتیں ہیں۔ وہ صبر و جبر دونوں کے قائل نہ تھی۔ گو مختلف مقامات پر کبھی ایک اور کبھی دوسرے رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ مگر غالب کی شاعری کے کلی تجزیے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں کوئی پہلے سے بنا ہوا نظریہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ زندگی کی پر پیچ وادی میں ہر موڑ پر نئے حالات و اقعات کی دید کے قائل اور ان کے مطابق زندگی ڈھالنے کا رویہ رکھتے تھے۔

غالب نے میدان عشق میں بھی خوب گھوڑے دوڑائے۔ مگر ان کا عشق ستی ہونے والا عشق نہیں ہے۔ جس میں عاشق عشق کو موت و زیست کے تمام معاملات پر محیط کر لیتا ہے۔ غالب کے ہاں عشق کا روائتی انداز بھی گو موجود ہے۔ اور تصوف کی باتیں بھی ہیں۔ بادہ خواری کے ساتھ مسائل تصوف کا بیان بھی ہے۔ ولی کہلوانے کا زعم بھی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اردو شاعری و ادب کو عشق کا ایک نیا اسلوب و انداز بخشا ہے جو جدید دور کے

جدید فلسفہ عشق سے ہم آہنگ ہے۔ غالب سے پہلے اور بہت بعد میں اب تک شعرو ادب میں عشق کا جو رنگ نمایاں ہے وہ عشق کو پوری زندگی پہ محیط سمجھنے کا رویہ ہے۔ جب عاشق عشق و محبت کو زندگی کی کل حقیقت سمجھتا ہے۔ غم جانان کے آگے غم دوران کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ غم عشق غم روزگار پر بھاری ہوتا ہے۔ غالب نے سب سے پہلے واضح طور پر غم حیات اور غم یار میں لکیر کھینچی ہے۔ انہوں نے عشق کو زندگی کا ایک جزو سمجھا ہے۔ یہ ان کی اردو شاعری کو بہت بڑی دین ہے۔ عشق کی اہمیت مسلم مگر عشق کل حقیقت نہیں۔ بھوک اور پیاس کی ماری اس دنیا میں عشق ہی ایک حقیقت نہیں کچھ اور بھی ہے اور وصل کی راحتوں کے علاوہ بھی اور راحتیں ہیں۔ غالب نے غم روزگار کو غم عشق کے ساتھ مساوی حیثیت دی ہے۔ خیال طرہ لیلیٰ زندگی بھر نہیں ہو سکتا۔ غم عشق اگرچہ جاں گسل ہے ۔ مگر دل کی دنیا اس سے زیادہ جامع اور وسیع ہے جو اس غم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر عشق کی کامیابی بھی انسان کے لئے کامل مسرت کا باعث نہیں بن سکتی۔ کیونکہ غم روزگار کے چرکے لاعلاج ہیں۔ غالب اس کھردری حقیقت سے آگہی رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا فلسفہ عشق غیر جذباتی' متوازن' معتدل' حقیقت پسندانہ اور صحت مند ہے ان کا یہ شعر جدیدیت کی جان اور نئے رویوں کا سنگ میل ہے ۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیر سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے ہیں

غالب کا عشق ایک انسانی عشق ہے۔ جو وصال کا طالب ہے جو وصل کے لئے بے قرار بھی ہے۔ مگر ہجر کے صدموں کو بھی سہہ سکتا ہے۔ غالب کے عشق میں روحانیت کا عنصر کم ہے۔ ان کا عشق اسی دنیائے آب و گل سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں روایتی انداز بھی ہے۔ جو عشق کی تمام کیفیات کے نشیب و فراز کو لئے ہوئے ہے۔ اور کبھی وہ عشق کو دماغ کا خلل بتاتے ہیں تو کبھی عمر بھر تصور جاناں کئے رہنے کی تمنا کرتے ہیں۔ کبھی ہم رخوں کے لئے مصوری سیکھنے کا ارادہ باندھتے ہیں۔ تو کبھی نامہ نویس کا روپ دھار کر صبح ہوتے ہی کان پر قلم دھر کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کبھی وہ فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔ یہ ان کے گلدستہ خیال کے گل ہائے رنگا رنگ ہیں۔ جو متنوع انداز میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ مگر غالب کا ہر انداز فکر آگہی فرزانگی اور فراست کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ ان کے ہاں خود فراموشی' خود بیزاری اور جہاں بیزاری کا رنگ نہیں ہے۔ بلکہ خود نگری اور خود آگاہی کی شمع روشن ہے۔ غالب کی شاعری' خود داری اور عزت نفس کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ غالب عشق میں بھی اپنی انا و انفرادیت اور وقار کے تحفظ کا سامان کرتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے یہ اشعار۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑ و برہمن کو

غالب کے عشق کی طرح ان کا محبوب بھی منفرد ممتاز ہے۔ وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا ہنستا بولتا اور متحرک و جاندار فرد ہے۔ وہ سادہ پرکار ہے۔ غالب ہی کی طرح شوخ و شنگ و تیز و طرار ہے وہ ہماری دنیا کا یہی ایک انسان ہے۔ جو دھڑکتا ہوا دل اور سوچنے والا ذہن رکھتا ہے۔ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں ۔ وہ غیر مرئی و ماورائی ہستی بھی نہیں وہ فرشتہ ہے نہ جن۔ شیطان ہے نہ عفریت بس انسان ہے۔ خوبیوں و خامیوں کا مجموعہ۔ وہ زن بازاری بھی نہیں ہے۔ جو بکنے والی بے آبرو مخلوق ہو۔ وہ روائتی دہلوی و بستان کا روحانی و افلاطونی محبوب ہے۔ نہ لکھنوی انداز فکر کا بیسوائی معشوق۔ غالب کا محبوب ذہین ہے ستم ظریف ہے۔ چالاک ہے طرحدار ہے۔ غالب کے محبوب پر غالب کی بھرپور چھاپ نظر آتی ہے۔ روائتی بے وفائی' جفا پیشگی اور بے مہری کے ساتھ ساتھ وہ منفرد خصوصیات کا حامل ہے جو اس کو نصابی کتابی روپ سے نکال کر زندگی کی حرارت کا حامل بناتی ہیں۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

پینے کو جب میں دھوتا ہوں اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

غالب کے کلام کا ایک حسن یہ ہے کہ اس میں نفسیاتی ژوف بینی کا پتہ ملتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے عکاس نظر آتے ہیں اور اپنے اشعار میں انہوں نے نفسیاتی مطالعے کے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ خوبی زندگی کے گہرے مشاہدے سے پیدا ہوئی ہے وہ کثرت نظارہ سے چشم دل کو وا کرنے کے قائل تھے۔ چشم دل وا ہو تو حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ غالب نے انسانی نفسیات کو بڑے دلپذیر اسالیب میں پیش کیا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم پاسباں کے لئے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
غیر پھرتا ہے تیرے خط کو لئے یوں
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

غالب کی غزل بڑی خوبصورت اور بامعنی ہے۔ اس میں موسیقیت و ترنم رچے بسے ہوتے ہیں۔ لفظ مصرعے اور شعر گنگنانے محسوس ہوتے ہیں۔ اسی لئے غالب کی غزلیں سب سے زیادہ گائی جاتی ہیں۔ ان کا مخصوص آہنگ و لب و لہجہ معنویت و رمزیت انہیں نمایاں حسن بخشتے ہیں۔ غزل سن کر کانوں میں سرکا رس دل میں جذبے کی کسک اور دماغ میں مفاہیم کا جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ بار بار سننے اور پڑھنے سے لطف و کیف بڑھتا ہی رہتا ہے۔ ان کا خیال وقیع

جذبہ صحیح تخیل رفیع اور اسلوب صبیح و ملیح ہے۔ بقول درد ہر مصرعہ جوں ابروئے پیوستہ دل میں جگہ پیدا کرتا ہے۔ چھوٹی بحر ہو یا بڑی ہر رنگ میں اسلوب ایک نئی شان دکھاتا ہے۔ خاص طور پر چھوٹی بحر میں سادہ پر کار غزلیں سہل ممتنع کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی غزلیات کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ ان میں بڑی حد تک وحدت تاثر اور وحدت مزاج کا پتہ چلتا ہے جو غزل جیسی صنف میں ایک منفرد بات ہے ان کی اکثر اچھی غزلوں میں ایک سوچ و موڈ کار فرما نظر آتا ہے جو غزل کے ریشے ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے۔

اچھی غزل کے لئے جن خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ غالب کی شخصیت و فن میں موجود تھیں۔ معنویت، رمزیت، حسن ادا، گہرائی، مٹھاس کا حسین اجتماع قدم قدم پر چلتا ہے۔ ان کے تغزل میں ایک دلپذیر گھمبیرتا ملتی ہے جوان کے شعرو فن کو دوسرے تمام شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ غالب نے اردو شاعری کی دماغ عطا کیا ہے۔ اس سے قبل اردو شاعری میں دل کی دھڑکنیں تو بڑی آسانی سے سنائی دیتی تھیں۔ مگر ذہن و دماغ کی شاعری کا ان طرہ امتیاز ہے۔ غالب شاعری کی حدیث دل کے ساتھ ساتھ حدیث دماغ بھی ہے۔ غالب کی بات دل سے نکل کر ذہن تک پہنچتی ہے۔ اور ذہن کی بات دل کے راستہ سے ہو کر اظہار کا روپ دھارتی ہے۔ غالب نے اپنی شاعری کے ذریعے فلسفیانہ مضامین کو بڑی خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اشعار میں منطقی انداز فکر بھی ملتا ہے۔ اور سائنس و معروضی اسلوب کی

پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ غالب کا سارا کلام منتخب ہے۔ ہر شعر پر فکری رفعت کی چھاپ ملتی ہے۔ غالب یوں بھی خوش قسمت تھے کہ انہیں اپنے دوران زندگی اپنا کلام خود منتخب کرنے کا موقع ملا اس طرح ایسے ایسے وجد آفریں اشعار منتخب ہوئے ہیں جو دل و دماغ میں فکرو جذبات کے کوندے لپکا دیتے ہیں اور سحرو افسوں کا سماں پیدا ہوتا ہے۔ غالب کا ہر شعر مثالی ہے۔

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
ناکردہ گناہوں کی حسرت کی ملے داد
ان کردہ گناہوں کی اگر کوئی سزا ہے

غالب نے لوازمات شعری سے بھی بھرپور کام لیا ہے۔ ان کا تخیل یوں بھی آفاق گیر تھا۔ ساتھ تمثیل کا رنگ بھی نمایاں تھا جو محاکات و مرقع کشی کے لئے مفید تھا۔ اس طرح نادر تشبیہات استعارات کا بر محل استعمال ہے۔ جو شعروں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے ابتدائی اسلوب میں جو طرز بیدل کے تتبع میں تھا۔ دو راز کا تشبیہات و استعارات کا وفور ہے۔ مگر رفتہ رفتہ انہوں نے سادگی کے انداز کو اپنایا اور اسی اسلوب میں خوبصورت اشعار پیش کئے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

غالب ترکیب سازی میں بھی شہنشاہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار با معنی تراکیب سے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا۔ اس طرح ایک بہت بڑی لسانی خدمت بھی سر انجام دی ہے۔ انہوں نے اپنی فارسی دانی سے بھرپور فائدہ حاصل کیا ہے۔ اسی روایت کو علامہ اقبال نے بعد میں آگے بڑھایا۔

غالب کو اپنی اپنے حسن بیاں پر بڑا ناز تھا اور اپنی شاعری میں جا بجا شاعرانہ تعلی کے انداز میں اپنی برتری کا اظہار کیا ہے۔ عموماً" شاعرانہ تعلی میں شعراء بے اندازہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ مگر غالب نے ایسے اشعار میں بھی معتدل آراء کا اظہار کیا ہے جس میں خودستائی کا رنگ غالب نہیں۔ بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے مل بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تا جوراز داں اپنا

غالب بلند پایہ شعر گوئی کے ساتھ شعر فہمی کا پاکیزہ ذوق سے بھی رکھتے تھے اور اچھے شعر کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ البتہ کم درجہ شعر کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ مومن خاں کے اس شعر کو سن سن کر سر دھنتے تھے

اور اس ایک شعر کے لئے اپنا پورا دیوان نذر کرنے کو تیار تھے۔ مومن کا شعر تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ ہر صورتحال میں ہار ماننے کے بجائے متبادل منطقی ربط اور جواز تلاش کر لیتے ہیں اور خجالت کو خوش طبعی سے ٹال جاتے ہیں۔ کسی بھی مشکل صورت حال میں وہ ذہانت کی راہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہ انداز مکر شاعرانہ سے الگ ہے اور غالب کے علاوہ بہت کم شعراء اس کا پتہ ملتا ہے مثال ملاحظہ کریں۔

ہوں تیرے نہ کرنے پر بھی راضی
گوش منت کش گل بانگ تسلی نہ ہوا

غالب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ حالی نے ان کو حیوان ظریف کہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شخصیت و مزاج میں مزاح و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ قدم قدم پر ان کی حس ظرافت پھڑک اٹھتی تھی۔ مشکل و المناک حالت میں بھی وہ زندہ دلی خوش طبعی کے اظہار سے باز نہیں رہتے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دنوں میں پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ حاسدوں نے غالب کو بھی پکڑوا دیا۔ فوجی عدالت میں پیشی ہوئی۔ انگریز کرنل نے دریافت کیا۔ تم مسلمان یا عیسائی۔ غالب نے کہا کہ آدھا مسلمان آدھا عیسائی۔

شراب پیتا ہوں، سور کا گوشت نہیں کھاتا۔ عدالت نے اس وقت بری کر دی۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاں ایک دعوت میں بادشاہ کوئی خاص چیز کھانے میں مصروف تھے۔ وہ غالب کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے نوکر کو خالی برتن لانے کے لئے کہا گیا۔ نوکر کے آنے ہی دیری ہوئی۔ وہ خاص ڈش کم ہو رہی تھی۔ غالب نے مزاحاً کہا کہ حضور جلدی کی ضرورت نہیں یہی پلیٹ خالی ہو جائے گی۔ بادشاہ نے خوش ہو کہ ساری پلیٹ بخش دی۔ اسی طرح غالب کا آموں کا شوق تو ضرب المثل تھا ہی۔ ان کا کہنا تھا کہ آم میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ ایک مرتبہ بادشاہ کے باغ میں ٹہلتے ہوئے آم کے پیڑوں کے پاس جا جا کر آموں کو الٹ پلٹ کر اس طرح دیکھتے جیسے پڑھنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ بادشاہ کے استفسار پر بتایا کہ کسی آم پر اپنا نام پڑھ رہا ہوں۔ کیونکہ ہر شے پر کھانے والے کا نام تحریر ہوتا ہے۔ اس حسن طلب سے خوش ہے کر بادشاہ نے کئی ٹوکرے آموں کے بھجوا دیئے۔ ایک مرتبہ کسی عزیز سے پاؤں دبوانے کے بعد اس کو ازارہ تفنن کہا کہ تم نے میرے پاؤں دبائے میں نے تمہارے پیسے داب لئے۔ ایک مرتبہ غالب دہلی کالج میں اردو کے پروفیسر کی آسامی کے لئے انٹریو کے لئے پالکی میں سوار ہو کر گئے۔ وہاں منتظر رہے کہ پرنسپل استقبال کے لئے نکلیں گے۔ جب کوئی نہ نکلا تو یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ میں نوکری کو ذریعہ عزت سمجھتا ہوں نہ کہ جو عزت پہلے سے موجود ہو۔ اس سے بھی ہاتھ دھو لئے جائیں۔ غالب کی شاعری میں بھی یہی مزاح و ظرافت کا

رنگ جھلکتا ہے۔ غالب دوسروں پر بھی ہنستے تھے اور خود اپنے آپ بھی ہنسنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ غالب اپنی ذات کو الگ کر کے اس کو استہزا کا نشانہ بناتے ہیں۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاندادۂ ہوائے سر راہ گذار تھا

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالب کی شاعرانہ حیثیت کے علاوہ ان کی مکتوب نگارانہ حیثیت بھی مسلمہ ہے۔ غالب کے خطوط ادب عالیہ کا حصہ ہیں۔ خطوط کی علمی و ادبی حیثیت کو غالب نے سب سے پہلے ادب کا حصہ بنایا۔ غالب شاعرنہ بھی ہوتے تو اپنے خطوط کے حوالے سے وہ بلند پایہ ادبی مرتبے کے حامل ہوتے۔ غالب نے بجا طور پر مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور اپنے خطوط کے ذریعے تاریخ ادب تنقید اور مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔

سر سید احمد خان

سر سید احمد خاں برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے عظیم علمبردار تھے۔ انہوں نے تاریخ کی ان قوتوں کا ادراک کر لیا تھا۔ جو انقلاب امریکہ' انقلاب فرانس صنعتی انقلاب اور سائنسی ارتقاء کی صورتوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں سرگرم عمل ہو گئی تھیں اور جنھوں نے آنے والے زمانوں تاریخ کے نشیب و فراز اور جغرافیائی و تہذیبی تغیرات کی شکل میں راہنما ہونا تھا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح سر سید احمد خاں کو بھی سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اپنے مشن کی تکمیل کی راہ میں کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ سر سید احمد خاں ہندوستان میں مسلم اقتدار و اختیار کے دور زوال کی پیداوار ہیں۔ مسلمانوں کی عظیم سلطنت خواب پریشان کی طرح بکھر چکی تھی اور برطانوی استعمار نے اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ دیئے تھے۔ ہندو' سکھ اور دوسری غیر مسلم قوتیں سر اٹھانے لگی تھیں۔ وہ فتنے جو مسلم قوت کے سامنے سرنگوں تھے' پھر سے پیدا ہونے لگے تھے۔ غیروں کی ریشہ دوانیوں اور اپنوں کی بے وفائیوں کی وجہ سے 1707ء کے بعد مسلم قوت کو اضمحلال آنے لگا۔

کابل سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت محدود ہوتے ہوتے شاہی قلعے تک رہ گئی تھی۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور مسلم اذہان پر انفعال بے بضاعتی، لاچارگی اور ناداری کے سائے ناچنے لگے تھے۔ سوچ کی راہیں مسدود ہو گئیں تھیں۔ اس تمام صورت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ مسدس حالی میں موجود ہے۔

اس مرحلے پر واضح طور پر تین بڑے رجحانات دیکھنے میں آئے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ مزاحمت کی پالیسی پسند کرتا تھا اور اپنے حقوق کے لئے قوت بازو اور میدان جنگ کا انتخاب کرتا نظر آتا تھا۔ یہ طبقہ حالات سے پنجہ آزمائی کا درس دیتا تھا اور برطانوی استعمار اور باطل کی قوتوں سے ٹکرا جانے کا عزم کئے ہوئے تھا۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا طبقہ مفاہمت تعاون اور ربط کا خواہاں نظر آتا تھا۔ اس طبقے کی منطق یہ تھی کہ اب تلوار کے ذریعے حقوق کا حصول ممکن نہیں رہا۔ اب جنگ کسی اور محاذ پر لڑی جائے گی اور اس کے میدان تعلیم، سیاست اور معاشرت ہوں گے۔ اب جنگ قانون کی ہے اس لئے مفاہمت اور تعاون کے ذریعے ہی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ تصادم اور مقابلے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا ملک و اقتدار چھن چکے ہیں۔ ان کی بازیابی انہی ہتھیاروں سے ہو گی جن ہتھیاروں سے کام لے کر حریفوں نے کامیابی حاصل کی تھی۔ تیسرا طبقہ مزاحمت اور مفاہمت دونوں سے بے نیاز و بیگانہ وقت کی موجوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ پہلے طبقے میں علماء کی اکثریت تھی۔ دوسرے طبقے

میں جدید نظریات کے حامل افراد کی کثرت تھی اور تیسرا طبقہ عوام الناس پر مشتمل تھا۔

سر سید احمد خاں اس دوسرے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو مفاہمت و تعاون کے وسیلے سے قومی ترقی کا خواہاں تھا۔ سر سید احمد خاں غیر جذباتی اور سائنسی دل و دماغ کے مالک تھے اور بہت بڑے حقیقت پسند تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس مرحلے پر برطانوی استعمار سے ٹکراؤ مسلمانان ہند کے لئے مشکلات و مصائب کا باعث بنے گا۔ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے حاصل کیا تھا اس لئے وہ اسی قوم کو کچلنے کے درپے تھے۔ ان کے اقتدار کی قوت کو کم کرنے کے لئے ضروری یہ تھا کہ ان کے ساتھ سمجھوتہ کیا جائے اور ان کو یہ تاثر دیا جائے کہ مسلمان مزاحم نہیں معاون ہیں۔ سر سید احمد خاں نہایت مخلصانہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کی بقا اسی میں ہے کہ وہ جدید تعلیم زبان نظریات اور تہذیب سے روشناس ہو۔ حربی برتری تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ جمہوری انداز فکر کی رو سے عددی برتری اور قوت بھی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب جو راستہ کھلا تھا وہ ذہنی و فکری ترقی و قوت کا تھا۔ سر سید یہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ نے دنیا میں جو عظمت و اقتدار حاصل کیا ہے وہ حربی اور عددی برتری کی بنیاد پر نہیں بلکہ ذہنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کے ذریعے ہی حاصل کیا تھا۔ چنانچہ سر سید نے مسلمانان ہند کی بقا و ارتقاء کے لئے اس راستے کو سچا جانتے ہوئے اپنانے کا فیصلہ کیا اور زندگی بھر اس مشن کی تکمیل میں

مصروف رہے۔

سر سید احمد خان ایک بڑے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بزرگ شاہی درباروں میں بڑے بڑے عہدوں پر متمکن رہے۔ خود سر سید احمد خان کو بھی کئی شاہی القاب اور خطابات ملے تھے۔ مگر سر سید کچھ اور ہی طرح کا ذہن لے کر آئے تھے۔ وہ ایک عہد آفرین شخصیت تھے۔ قدرت نے ان سے بہت کام لینے تھے۔ سر سید نے معمول کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی ملازمت اختیار کی۔ کافی عرصہ سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے۔ معمولی ملازمت سے آغاز کر کے مجسٹریٹ کے عہدہ تک پہنچ گئے اور اس دوران اہم فرائض سرانجام دیئے۔ جنگ آزادی 1857ء کے موقع پر سر سید بجنور میں متعین تھے۔ وہاں انہوں نے کئی انگریزوں جانیں بچائیں تھیں۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپنا شروع کیا اور ہندو بھی اس کام میں ان کے ہمنوا بن گئے ۔ سر سید کو اس بات کا بڑ قلق تھا۔ گو وہ سرکاری ملازمت میں تھے مگر انہوں نے انتہائی جرات مندی کے ساتھ مسلمانوں کی وکالت کا فیصلہ کیا اور ایک تاریخی دستاویز رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے نام سے تحریر کیا۔ جس میں دلائل وشواہد کے ساتھ یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جنگ آزادی دراصل انگریزوں کی اپنی زیادتیوں، ناانصافیوں اور مظالم کا شاخسانہ تھی اور صرف مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرانا بددیانتی کے مترادف ہے۔ یہ رسالہ چھاپ کر سر سید نے نہ صرف ہندوستان

میں اس کی تشہیر کی بلکہ اس کی نقول لندن میں برطانوی ممبران پارلیمنٹ کو بھی ارسال کیں ۔ جس سے برطانوی رائے عامہ کو ہندوستان کے صحیح حالات معلوم ہوئے اور ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ سر سید احمد سے سختی سے باز پرس ہوئی۔ رسالے پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس کی نقول حاصل کر کے ضائع کر دی گئیں مگر سر سید اپنی حق گوئی کی راہ سے نہ ہٹے۔ سر سید اس کے بعد بھی کچھ عرصہ ملازمت کرتے رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ اپنی قوم کی بہتر طور پر خدمت کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کی مصروفیات بڑھیں تو انہوں نے سرکاری ملازم کو خیرباد کہہ دیا اور کل وقتی طور پر قومی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

سر سید کی خدمات اتنی متنوع اور ہمہ جہت ہیں کہ ان کا احاطہ زیر نظر تحریر میں ممکن نہیں۔ان کی خدمات کا دائرہ سیاست ' معاشرت ' تعلیم ' زبان ' ادب ' صحافت ' ہر شعبہ حیات تک وسیع ہے۔ سر سید تعلیم کو تمام مسائل کی کنجی سمجھتے تھے۔ اور اس پر انہوں نے سب سے زیادہ توجہ دی۔ وہ تعلیم کی ایک کلی عمل قرار دیتے تھے جو انسان کی مکمل اصلاح کا باعث بنتا ہے۔ بد قسمتی سے سر سید صرف انگریزی تعلیم کو ہی تعلیم سمجھتے رہے۔ حالانکہ وہ خود مروجہ مشرقی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہو چکے تھے۔ ان کے کردار کی تشکیل و تعمیر مشرقی تہذیب و تمدن ' تعلیم و تدریس اور فکر و نظریات کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ مگر سر سید نے براہ راست مغربی تعلیم کبھی حاصل نہیں کی۔ وہ انگریزی تعلیم و

تربیت سے سخت متاثر تھے۔ اس لئے وہ زندگی بھر ملازمت کے دوران، سماجی تعلقات، سرکاری فرائض اور دوسرے ذرائع سے انگریزی تعلیم و تہذیب سے واقفیت حاصل کرتے رہے۔ سر سید انگریزی بول سکتے تھے مگر لکھ یا صحیح طور پر پڑھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انگریزی تقاریب میں وہ انگریزی کو اردو رسم الخط میں لکھ کر پڑھا کرتے تھے۔ سر سید ایک جدید ذہن اور جدت پسند طبعیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے تمام مسائل کا علاج انگریزی تعلیم و تہذیب کو سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں وہ قدرے انتہا پسندی کا بھی شکار تھے۔

بہر کیف تاریخ کے اس لمحے میں جس آپریشن کی ضرورت تھی وہ سر سید کے ہاتھوں ہونا قرار پایا۔اس زمانے میں یہ کم کارنامہ نہ تھا۔ ہمارے علماء اور دوسرے انگریز دشمن طبقے انگریزی تعلیم زبان، لباس، تہذیب و تمدن کے کٹر دشمن تھے۔ وہ انگریزوں سے ہاتھ ملانے تک کو گناہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انگریزوں سے ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ کو صابن سے دھونا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح فونٹین پن، سائیکل اور دوسری انگریزی اشیاء کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ ایسے عالم میں سر سید اٹھ کر انگریزی تعلیم و زبان، تہذیب و ثقافت کا پرچار کرے اور ان طبقوں کے غیض و غضب کا نشانہ نہ بنے۔ چنانچہ سر سید کو کافر اور ملحد قرار دیا گیا۔ ان پر ہر طرح کے الزام، بہتان اور دشنام کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ ان کے گلے میں جوتیوں کے ہار پہنا دیئے گئے۔ مگر وہ اللہ کا بندہ اپنے مشن کے لئے آگے ہی بڑھتا گیا۔ انگریزوں کا پٹھو انہیں قرار دیا گیا۔ غرض کونسی

ایسی گالی تھی جو ان کو نہ دی گئی۔ سرسید کے نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے خلوص محنت' دیانت اور قربانی پر حرف نہیں لایا جا سکتا۔ ممکن ہے سرسید کی تشخیص اور علاج دونوں ٹھیک نہ ہوں۔ ان کا دل قوم کے درد سے معمور تھا۔ قوم کی خدمت ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اپنی زندگی کا سکھ چین انہوں نے تج دیا تھا۔ وہ چندہ حاصل کرنے کے لئے گلی گلی' قریہ قریہ' گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرے۔ کہیں پھولوں کی بارش ہوئی تو کہیں جوتوں کی۔ مگر وہ سزا و انعام سے بے نیاز اپنے مقصد میں آگے بڑھتے رہے۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج کو تصور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ کالج دراصل پاکستان کی خشت اول اور دو قومی نظریے کی متحجر شکل ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ سرسید کا تعلیمی مشن مسلمانوں کے جداگانہ تفرد و تشخص کی طرف جا رہا تھا۔ علی گڑھ مسلمانان ہندو کی آرزوؤں کا مرکز بن کر ابھرنے لگا۔ یہ نہ صرف تعلیمی درس گاہ تھی اس کے ساتھ مسلمانوں کی تہذیبی' سماجی' تمدنی' معاشرتی عملی ثقافتی نظریات کا جدید روپ بھی تھا۔ پورے برصغیر سے مسلمان اپنے بچوں کو اس درسگاہ میں حصول علم کے لئے بھیجتے۔ سارے ملک سے اسے چندہ ملتا۔ چنانچہ علی گڑھ قومی وحدت کا نشانہ بن کر ظاہر ہونے لگا۔ سرسید مسلمان قوم کو زیور تعلیم سے آراستہ کر کے میدان عمل میں اتارنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ نئی دنیا' نئی زندگی اور نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی ذات اپنے مقام اور اپنے مستقبل کا شعور

حاصل کریں۔ چنانچہ عل گڑھ سے نکلنے والی پود اور علی گڑھ کے نظریات سے متاثر ہونے والے افراد نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سر سید کی مدافعت یا مخالفت دونوں ہی قوم کو راس آئیں۔ اس سے قوم کی ذہنی نشو و نما ہوتی رہی۔ سر سید اپنے دور میں جدیدیت، مغربیت اور سیاست کی علامت کے طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ قوم کا سیاسی شعور، معاشرتی اور سائنسی نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ اس سے لئے سر سید کو جدید نسل کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ سر سید کو آنے والے دور کی تصویر صاف نظر آ رہی تھی۔ آج ساری دنیا جس سائنسی اور فنی تہذیب کی لپیٹ میں ہے۔ اس کے اثرات سر سید نے بہت پہلے محسوس کر لئے تھے۔ سر سید اس آنے والے دور کے لئے مسلمانوں کو تیار کر رہے تھے۔ یہ دور آنا تھا۔ سر سید منصۂ شہود پر آتے یا نہ آتے۔ اس دور کا ظہور تاریخی ضرورت اور سماجی و سیاسی جبر تھا۔ جس کے آگے بند باندھنا آسان کام نہ تھا۔ سر سید کا پیام جدیدیت کے سمندر میں اترنے کے لئے پیراکی کی تربیت حاصل کرنا تھا۔ سر سید نے علی گڑھ کالج کے ساتھ کچھ اور سماج، تعلیمی، سائنسی ادارے بھی قائم کئے۔ جس سے مسلمانوں کو فکری نشو نما ان کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا ہو اور وہ ماضی کے فرسودہ ازکار رفتہ بیمار خیالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے نئے دور کی اچھائیوں کو قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

سرسید سائنٹیفک سوسائٹی نے اس ضمن میں فکری انقلاب پیدا کرنے کی پوری سعی کی۔ سرسید قومی ترقی کے لئے ہر کام سرانجام دینے کو تیار تھے۔ سرسید نے تعلیم کے ذریعے ابدی چکر توڑنے کی کوشش کی جس کے گرداب میں مسلمان گرفتار تھے۔ سرسید دیکھ رہے تھے کہ مسلمان اگر اسی طرح جدید تعلیم و نظریات کی دشمنی میں مبتلا رہے تو وہ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت سے چھٹکارا پانے کے بعد اور انگریزی تسلط میں آنے کے ساتھ پرپرزے نکالنے شروع کئے اور وہ پوری طرح نئے نظریات، نئی تعلیم کے حصول کے لئے آگے بڑھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اقتدار کے جزیروں پر ان کا قبضہ ہونے لگا۔ انتظامیہ، سیاست، قانون طب اور دوسرے شعبوں میں ان کو پذیرائی ملنے لگی۔ مسلمان جو کل تک حکمران تھے وہ اپنے قومی تفاخر کی پگڑی سنبھالے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ اس صورتحال میں سرسید نعرہ مستانہ لگا کر میدان میں اترے اور اپنوں، غیروں، سبھوں کی طعن و تشنیع کے باوجود اعلیٰ ترین قومی مفاد میں اصلاح قوم کا علم اٹھا لیا۔ سرسید کو قدامت پسند مسلمانوں، متعصب ہندوؤں، بے رحم حکمرانوں، ان پڑھ مسلمانوں سب کی مخالفتیں سہنی پڑیں۔

سرسید کے یوں تو بے شمار کارہائے نمایاں ہیں مگر ادب کے میدان میں ان کے کارنامے سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔ سرسید محض ایک ماہر تعلیم، ماہر سیاست ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور جید فاضل بھی تھے۔

وہ انتہائی ذہین شخص تھے۔ اگر ان کے ادر کارناموں سے قطع نظر محض ادبی خدمات کو سامنے رکھا جائے تب بھی ان کا شمار اردو کے نامور ترین ہستیوں میں ہوتا ہے۔ سر سید کو بجا طور پر جدید نثر کا بانی کہا جاتا ہے۔ ہماری قدیم نثر محض داستانوی و افسانوی رنگ میں رنگی شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلی فارسی عربی کی موٹی تہیں لئے قافیہ اور رویف کے چٹخاروں سے بھری ایک رنگین مرصع نثر تھی جس میں الفاظ کے طوطے مینا تو خوب اڑائے جا سکتے تھے۔ 'جنوں' پریوں کی کہانیاں اور الف لیلیٰ قصے رقم کئے جا سکتے تھے۔ شعروں کی تشریحیں اور شاعروں کے تذکرے مقفیٰ و مسجع انداز میں لکھے جا سکتے تھے۔ مفرس معرب زبان اور مابعد طبیعاتی اسلوب میں کہانیاں' قصے' اور خط تو لکھے جا سکتے تھے۔ مگر علمی' تعلیمی' سماجی' تہذیبی' معاشرتی' سیاسی' عمرانی اور سب سے بڑھ کر سائنسی موضوعات کو پیش کرنے کی سکت نہ تھی۔ سر سید کو اپنے سیاسی' سماجی' تعلیمی مشن و تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے جس زبان کی ضرورت تھی وہ انہیں میسر نہ تھی۔ چنانچہ سر سید نے شعوری کوششوں سے ایک نئی زبان اور نئی نثر کو رواج دینے کا عظیم کام بھی شروع کیا۔ آج جو نثر بھی موجود ہے وہ سر سید کی دین ہے۔ سر سید سے پہلے غالب نے سادہ نثر لکھنے کی ابتداء کی تھی مگر غالب کی نثر خالص نجی نثر تھی اور خطوط تک محدود تھی جو تحریک و روایت نہ بن سکی۔ سر سید نے نثر کو شاعرانہ لوازمات' قافیہ رویف' بے جا فارسیت' عربیت مشکل پسندی اور داستانوی کے خول سے نکال کر اسے جیتی جاگتی زندگی کے مسائل'

حقائق اور واقعات کے اظہار کا پیمانہ بنایا۔

انہوں نے نثر کو آسمان سے اتار کر زمین سے ہمکنار کیا اور اس طرح پھر اس آفاقیت کا حامل بنا دیا۔ سر سید نے سادہ، سلیس، قابل فہم، مقصدی اور بامعنی نثر کا آغاز کر دیا۔ سر سید نے نثر کو نجی نہاںخانوں سے نکال کر اجتماعی مقاصد و نظریات کا حامل بنایا۔ اس میں مقصدیت، اجتماعیت، آفاقیت، منطق، جوش، جذبہ، خلوص، اور سب سے بڑی بات یہ کہ شخصیت کو شامل کیا۔ نثر کو تصنع کے خول سے نکال کر فطری بنایا۔ دل کے جذبات علمی افکار سائنسی نظریات کے پیش کرنے کا اہل بنایا۔ سر سید کا یہ واحد کارنامہ تاحشر اردو سے محبت کرنے والوں کو یاد رہے گا۔ آج علم و ادب، تحقیق، تاریخ، سیاست، مذہب کا جس قدر سرمایہ اردو نثر میں موجود ہے۔ وہ سر سید کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سر سید خود بھی بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی نثر میں سادگی سلامت کے ساتھ ساتھ مقصدیت، معنویت زور و جوش موجود ہے۔ وہ خوبی بیان سے زیادہ اظہار مدعا کے زیادہ قائل تھے۔ ان کی تحریر منطقی ربط کی حامل ہوتی تھی۔ وہ پورے یقین اور زور خطابت کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انہوں نے زبان سے بھرپور کام لیا ہے انہوں نے خود زبان و ادب کی اصلاح بھی اسی جدید نثر کے ذریعے کی۔

سر سید کی نثر میں بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اصلاح کا رنگ بھی قدم قدم پر ملتا ہے۔ ان کی اکثر تحریریں اخلاقی

لیکچر کا درجہ بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد اور مشن میں گم تھے۔ قومی اصلاح کا جذبہ ان پر پوری طرح مسلط تھا۔ بایں ہمہ ان کا اسلوب تحریر جاندار پر جوش، پر خلوص متحرک اور فعال ہے جس میں تعقل پسندی اور سائنسی انداز پوری طرح رچا بسا ہے۔ ان کے خیالات پر مشرقی روایات کے ساتھ انگریزی فکر کی بھی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ جو اسلوب کے تار و پود میں پوری طرح گھل مل کر تحریر کو نئی آب و تاب بخشتی ہے۔ فکر مغرب کے ساتھ انگریزی الفاظ میکانکی انداز میں قدم قدم پر مل جاتے ہیں جس سے ایک طرف تو زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف زبان کو حیات نو ملتی ہے۔ اس میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا ہوتی ہے۔ سرسید پر جب مقصدیت کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوتی ہے تو ان کے اسلوب کی ادبیت، شعریت اور جمال ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

سرسید نے صحافت کی دنیا میں بھی انقلاب برپا کیا۔ جب 1869ء میں وہ برطانیہ گئے تو انہوں نے وہاں کی سماجی، معاشی اور ادبی زندگی کا براہ راست مطالعہ کیا۔ وہاں انہوں نے مشہور زمانہ جرائد سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے اثرات ملاحظہ کیے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ برصغیر میں تو شعر و ادب کو محض ذہنی عیاشی کے طور پر برتا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ ہندوستان میں بھی ادب و شعر اور صحافت کو قومی خدمت، بیداری اور ترقی کے لئے استعمال میں لانے کی سعی کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے وہیں پر اپنے رسالے

تہذیب الاخلاق کا بلاک بنوایا اور واپس آنے کے بعد اس عظیم ادبی، سماجی مجلّے کو اصلاح قوم اور تہذیب ادب کے لئے شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کے ذریعے انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ادبی، تہذیبی، معاشی معاشرتی، تعلیمی زندگی کے بارے میں مضامین و مقالات پیش کئے۔ انہوں نے خود بھی جامع مقالات سپرد قلم کئے اور اپنے رفقاء حالی۔ شبلی محسن الملک، وقار الملک سے بھی مضامین لکھوائے۔ ذہنی و فکری اصلاح کا بہت بڑا کام اس رسالے کے ذریعے عمل میں آیا۔ بامقصد قومی صحافت کا آغاز ہوا۔ قومی خدمات اور کارناموں سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔ اس طرح قومی یکجہتی، ربط و تحفظ کے فروغ کے لئے مثبت و مربوط مساعی کو تیز کیا گیا۔ دو قومی نظریے کے فروغ کا سامان بھی ہوا۔

سر سید کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کو مخلص محنتی اور ذہین ادباء فضلاء و شعراء کی ایک ٹیم میسر آگئی۔ جنہوں نے سر سید نے مشن کو مختلف میدانوں میں آگے بڑھایا۔ اس گروہ کے سرخیل مولانا حالی ہیں۔ جن کی لازوال علمی ادبی خدمات نے ان کو اردو کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا دیا ہے۔ حالی کے کارنامے تحقیق، تاریخ، سماجیات، صحافت، سوانح کے میدانوں میں جو ہیں۔ اس سے قطع نظر شاعری میں ان کا مقام انتہائی بلند ہے۔ سر سید سکول کے وہ سب سے بڑے شاعر تھے۔ جنہوں نے شاعری میں فکر سر سید کو فروغ دیا۔ اس طرح جدید اردو شاعری کے ذریعے سر سید کے افکار کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔

علامہ شبلی جو اگرچہ بعد میں سر سید کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس گروہ کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ انہوں نے تاریخ سوانح، شعروادب، منطق مذہب کے میدان میں مسلمانوں کی عظمت گذشتہ کے ابواب بلند پایہ تصانیف کی صورت میں قوم کے سامنے پیش کیے۔ جس سے مسلمانوں میں بیداری اور خودداری پیدا ہوئی۔ اس طرح سر سید کے افکار اور تحریک سے بالواسطہ طور پر متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے جدید شاعری اور تاریخ و صحافت کے ذریعے اس مشن کی تکمیل میں حصہ لیا۔ نذیر احمد جو اگرچہ اس تحریک کی فضاء میں سانس لے رہے تھے۔ انہوں نے ناول اور کہانی کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور جدید فکر کو اصلاحی جذبے کے ساتھ کہانیوں کے روپ میں پیش کیا۔ ان سب حضرات کی مساعی سے اردو نثر کا دامن مالا مال ہو گیا۔اس لئے اس دور کو اردو نثر کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اور اس دور کے امام سر سید احمد خاں تھے۔ جو مصلح، مفکر، معلم، ادیب، شاعر، سیاست دان زبان ساز عہد ساز اور تاریخ ساز شخص تھے۔

سر سید کی لسانی، تعلیمی اور صحافتی خدمات سے قطع نظر ان کی ذاتی، علمی اور ادبی حیثیت اس دور کے کسی بھی بڑے ادیب سے کم نہ تھی۔ ان کی آثار الصنادید، خطبات احمدیہ، رسالہ اسباب بغاوت ہند اور مقالات کے مجموعے ان کی جداگانہ ادبی حیثیت متعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔ خطبات احمدیہ ان کی لازوال علمی و مذہبی تصنیف ہے۔ یہ تصنیف علمی لحاظ سے بلند مرتبت ہے۔ اس کے ساتھ سر سید کے عشق رسول، مذہبی عقائد اور غیرت اسلامی

کی بھی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ مشہور انگریز مصنف سر ولیم میور نے آنحضرتؐ کے بارے میں ایک کتاب تصنیف لکھی تھی۔ جس میں حقائق سے روگردانی کرتے ہوئے غلط بیانیوں سے کام لیا گیا تھا۔ سر سید نے اس کتاب کا جواب خطبات احمدیہ کی صورت میں انگلینڈ میں بیٹھ کر غیر مسلم مورخین' اہل علم کے دلائل کی بنیاد پر تحریر کی۔ ایک موقع پر جب سر سید لندن میں تھے تو ان کے پاس سرمایہ ختم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کے میرا گھر' میرا باغ' میرا کتب خانہ بیچ دو مگر مجھے سرمایہ بھیجو تاکہ میں اس انگریزی کتاب کا جواب مکمل کر سکوں۔ سر سید کے مذہبی نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اور واقعی بعض نظریات قابل اعتراض بھی ہیں۔ مگر سر سید نے جس ایقان و ایمان کے ساتھ اسلامیان ہند کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی مثال برصغیر میں ملنی شکل ہے۔

سر سید کی تحریک اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے ہندوستان کی سب تحریکوں پر بھاری ثابت ہوئی۔ اس کے اتنے دور رس اثرات مرتب ہوئے کہ آج تک ان کی کار فرمائی جاری ہے۔ سر سید ایک زمانے میں مخلوط ہندوستانی قومیت کے تصور کے حامی تھے۔ مگر گہرے مشاہدے اور ہندوؤں کی اردو دشمنی کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان دو قومیں بستی ہیں۔ جو اپنی تہذیب و تمدن' روایات و ثقافت کے لحاظ سے منفرد مختلف ہیں۔ مسلمان شاندار ماضی اور تابناک مستقبل کے حامل ہیں۔ اگر ان کا حال ٹھیک نہیں تو

فکر کی کوئی بات نہیں۔ گویا یہ دو قومی نظریے کا برملا اظہار تھا۔

علامہ شبلی نعمانی

اردو شعر و ادب کی دنیا میں بلاشبہ شبلی نعمانی کا نام ایک درخشاں آفتاب کی طرح فروزاں رہے گا۔ دنیائے علم و فضل کے اس دیو پیکر ادیب کے سامنے بڑے بڑے عالم فاضل بونے نظر آتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے چاند ستارے آفاق علم پر ہمیشہ مسکراتے رہیں گے۔ جس میدان میں انہوں نے قدم بڑھائے وہاں پھر ان کا ہی سکہ چلنے گا۔ وہ تحقیق تدقیق تاریخ سوانح تصنیف، منطق، تعلیم، شعراور ادب کی دنیا کے بادن گزے تھے۔ جنہوں نے ہر میدان میں فتح و کامرانی کے پھریرے اڑا دیئے۔ جس شعبے میں بھی قدم رکھا۔ وہاں پر موجود پہلی مخلوق کے چراغوں کو بے نور کر کے اپنے چاند چمکا دیئے۔ علامہ شبلی رفقائے سر سید میں سب سے زیادہ فاضل اجل ہستی تھے وہ صحیح معنوں میں علامہ کہلانے کے حقدار تھے۔ علامہ شبلی نے یہ مقام و اعزاز قحط الرجال کے بنجر دور میں حاصل نہیں کیا۔ بلکہ شعر و ادب اور علم و تحقیق کے اس سنہری دور میں حاصل کیا۔ جب ایک سے ایک بڑا عالم شاعر، صحافی نقاد اور مورخ قدم قدم پر ملتا تھا۔ سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، محسن الملک، وقار الملک ذکا اللہ، امیر علی، سرشار، کہکشاں کے ستاروں کی طرح اس دور میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ جنہوں نے نظم و نثر کے میدان میں کارہائے نمایاں

انجام دیئے۔

یہ دور ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تعلیمی ادبی اور ثقافتی زندگی کا ایک انقلاب آفریں دور تھا۔ جب ہر شعبہ حیات میں صدیوں کے منجمد افکار کی برف پگھل رہی تھی۔ سوچ کی راہیں پھیل رہی تھیں پرانے سانچے ٹوٹ اور نئے اسالیب جوان ہو رہے تھے۔ مغربی تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کی جڑیں ہندوستانی سماج کے اندر پھیلنے لگی تھیں۔ انگریزی زبان و تعلیم کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ شکست و ریخت اور تخریب و تعمیر کا عمل جاری تھا۔ اس ہنگامی فضا میں بڑی بڑی عظیم سیاسی و ادبی شخصیتیں وجود میں آئیں جنہوں نے ہندوستانی ادب سماج، سیاست اور ملک کا نقشہ بدلنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سرسید احمد خاں ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ اس اہرام مصر کے سائے میں ہندوستانی سیاست و آداب کے نئی دھاروں نے پرورش پائی۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء نے مسلمانان ہند اور اردو زبان و ادب کی گراں بہا خدمات سر انجام دی ہیں سرسید ہندوستان میں جدید نثر اور نسل کے بانی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی اصلاح قوم و ملت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ انہوں نے ہندوستانی سوچ کو جدیدیت اور مقصدیت سے روشناس کرایا اور اپنی عظیم تحریک اصلاح کے لئے ایک لسانی انقلاب کے ذریعے اردو زبان بیان، نثر اور نظم کو فروغ دیا۔ بلکہ انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مخلص انتھک اور ذہین افراد کی ایک ٹیم بھی پیدا کر دی جنہوں نے ان کی تحریک کو مختلف جہتوں میں آگے بڑھایا۔ سرسید نے وہ فضا تیار کر دی جس میں جدید اور ریجنل

سوچ رکھنے والے ذہن تیار ہو سکیں۔

اسی جدیدیت اور مقصدیت کی ذہنی فضا میں علامہ شبلی نے بھی سانسیں لیں۔ اور تحریک سرسید کے اندر داخل ہو کر اور اپنی راہ لگ بنا کر الگ ہو گئے۔ سچ ہے شبلی کسی کے پیچھے چل ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے کارواں کے خود ہی سرخیل تھے۔ شبلی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے جو اپنی راہیں خود بناتی ہے۔ وہ طوفانی جوشیلی شخصیت کے مالک تھے۔ مناظرے' مقابلے' مجادلے' مسابقے سبھی کے قائل تھے۔ 1857ء کے طوفانی اور ہنگامہ خیز سال میں پیدا ہوئے اور 1914ء کے اس خونی سال میں وفات پائی جب سارا عالم پہلی جنگ عظیم کی لپیٹ میں تھا۔ وہ سیماب صفت انسان تھے۔ کسی کل قرار نہیں آتا تھا۔ ٹھہراؤ اور مقام ان کا مسلک ہی نہیں تھا۔ آگے بڑھنا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف عمل رہنا ان کا شیوہ تھا۔

علم کے عاشق تھے۔ شہر علم نبی مصطفیٰ کے عاشق تھے۔ یہی ان کی شخصیت کی دو کلیدیں ہیں۔ حصول علم کے لئے ہر مصیبت لینے کو تیار تھے۔ اسی لئے زندگی بھر دم نہیں لیا۔ کشکول لئے قریہ قریہ' کو بہ کو' شہر شہر پھرتے رہے۔ علم کے ہر دروازے پر دستک دینے کو تیار تھے۔ ایک استاد کے پاس گئے۔ ان کے پاس پڑھانے کو فرصت نہ تھی۔ چنانچہ علامہ شبلی نے یہ راہ نکالی کہ اس ہستی سے درخواست کی اپنے مدرسہ تک آتے اور جاتے راستے میں سبق پڑھا دیا کریں چنانچہ شبلی نے اس طرح چلتے پھرتے بھی علم کے موتی اپنے دامن میں سمیٹے۔ اپنے بھائی کو علی گڑھ میں داخل کروانے گئے۔ اور پھر وہیں کے ہو گئے۔ وہاں سرسید نے ملاقات ہوئی۔ ان کی لائبریری دیکھی اور پاؤں پسار دیئے۔ سید

کے کتب خانے میں مشرق و مغرب کی نایاب کتب کا خزینہ موجود تھا۔ سر سید بھی گوہر نایاب کو بھانپ گئے۔ چنانچہ اپنی لائبریری کے دروازے ان پر کھول دیئے۔ وہاں رہ کر شبلی کے ذہن و فکر کو جلا ملی۔ جدید علوم، مغربی تعلیم، علی گڑھ کے اثرات اور سر سید کی صحبت نے شبلی کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ سر سید کی لائبریری کو پی کر ہی وہاں سے نکلے۔

قیام علی گڑھ کے دوران بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ المامون اسی زمانے کی یادگار ہے جس کا مقدمہ سر سید احمد خان نے بڑی محبت سے لکھا۔ سیرۃ النعمان بھی اس دور کی پیداوار ہے۔ اس زمانے میں سر سید کے ساتھ گہری وابستگی تھی۔ سر سید 1879ء میں جب لندن گئے تو شبلی علی گڑھ میں ہی تھے۔ سر سید نے سر ولیم میور کی کتاب پیغمبر محمدؐ" کا جواب خطبات احمدیہ کی صورت میں اپنے قیام لندن کے دوران لکھا۔ ایک موقع پر جب سر سید کو کچھ مالی مشکلات پیش آئیں اور کتاب نامکمل تھی تو انہوں نے شبلی کو لکھا کہ میرا گھر، میرا باغ، میرا کتب خانہ سب بیچ دو مگر مجھے رقم بھیجو کہ یہ تصنیف مکمل کر کے آؤں۔ شبلی علم کی نہ مٹنے اولی پیاس رکھتے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ میں ہی پروفیسر آرنلڈ کو عربی سکھائی اور اس کے بدلے خود فرانسیسی سیکھنے کا کام شروع کیا۔ تاکہ مغرب میں اسلامی تاریخ و مذہب پر جو کام ہوا ہے اس تک رسائی حاصل کریں۔

بعد میں شبلی کے تعلقات سر سید سے بھی کشیدہ ہو گئے اور وہ سر سید کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ اسے طبائع کا اختلاف اور دوسرے لوگ اسے شخصیتوں کے تصادم کا نام دیتے ہیں۔ سلیمان ندوی الفاروق کو درجہ

اختلاف بتاتے ہیں۔ اور شبلی نامہ کے شیخ اکرام اسے لیڈر شپ کا قضیہ قرار دیتے ہیں۔ ان سب باتوں سے سے قطع نظریہ حقیقت ہے۔ کہ دونوں کا مقصد ایک تھا مگر جہتیں جدا تھیں، مرض کی تشخیص دونوں ہی کر چکے تھے مگر علاج دونوں نے مختلف تجویز کئے تھے۔ ایک ماضی سے کٹ کر مستقبل کو روشن کرنا چاہتا تھا تو دوسرا ماضی کو اجال کر مستقبل کو فروزاں کرنا چاہتا تھا۔

شبلی نے الفاروق کے لئے مواد اکھٹا کرنے کی غرض سے بلاد اسلامیہ کا سفر بھی اختیار کیا۔ علی گڑھ سے ناطہ توڑ کر وہ کچھ عرصہ حیدر آباد میں بھی مقیم رہے مگر وہاں بھی سیاسی ریشہ دوانیوں کے سبب ان کا دل نہ لگا۔ چنانچہ لکھنؤ آکر ندوۃ العلماء میں تصنیف تالیف کے کام کو آگے بڑھایا۔ مگر کچھ عرصے بعد وہاں سے بھی جی اچاٹ ہو اور اعظم گڑھ آکر دار مصنّفین کی بنیاد ڈالی اور اس کے لئے اپنی کل جائیداد اور اثاثے وقف کر دئے۔ ندوہ اور دارلمصفین نے علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

شبلی لافانی ادیب اور بے بدل عالم تھے۔ ان کی تصانیف اردو ادب کے تاج محل ہیں۔ جن کا حسن و وقار، عظمت و رفعت کبھی ماند نہیں پڑ سکتے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا اس موضوع پر حرف آخر تصنیف کر کے رکھ دیا، اگلے پچھلے سب مصنفوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔ بقول شیخ اکرام اگر شبلی کی تصانیف کو اردو ادب سے نکال دیا جائے اس کی ثروت میں بڑی حد تک کمی آجائے گی۔ اور شبلی کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر اردو ادب کی جان ہے، تاریخ تنقید، سوانح، فلسفہ، سیرۃ کے میدانوں کے بادشاہ ہیں۔ جس میدان میں وہ ڈیرے ڈالتے ہیں وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ ان کی تصانیف حوالے کی کتب

اور ان کی آراء سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں تاریخ تخلیق' تنقید سوانح حقیقت افسانہ ڈرامہ اس طرح گڈ مڈ ہوتے ہیں کہ ان کو الگ کرنا محال ہے۔

جب ان کا اشہب قلم رواں ہوتا ہے تو الفاظ تراکیب' جملے' باب ہاتھ باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تحریر کا منہ زور گھوڑا تحقیق و تاریخ کی سنگلاخ زمینوں میں چنگاریاں اڑانے لگتا ہے۔ شبلی رفیع الشان موضوعات کے ذیشان ادیب تھے۔ جن کے قلم نے فقید المثال تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ شبلی کا مسلک اسلامی تاریخ کے روشن ابواب کو زندہ کرکے قوم کے سامنے پیش کرنا اور ان کے اندر اپنے ماضی کو پہچاننے کا ذوق پیدا کرنے اور اس کی روشنی میں مستقبل کو سنوارنے کی امنگ پیدا کرنا تھا وہ اسلامی تہذیب و تاریخ کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ وہ مذہب اسلام کی رفعتوں کو ماضی کے گرد آلود نہاں خانوں سے نکال کر حال کے آئینہ خانوں میں سجانا چاہتے تھے۔ وہ معذرت خواہانہ تعبیر و تفسیر کے قائل نہ تھے۔ بلکہ جارحانہ انداز میں اپنے عقیدے کی صداقت کو علم و ثقافت کے میدانوں میں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب تھے۔ نہ خوفزدہ بلکہ وہ اپنے اسلامی تمدن و تاریخ کے مقابلے میں مغربی فکر و فلسفہ کو ہیچ گردانتے تھے۔

وہ اسلامی تاریخ کے بہت بڑے مفسر اور اس کے بہت جری محافظ تھے۔ وہ اسلامی تاریخ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف علم جہاد لے کر اٹھے اور دلائل و براہین کی تلوار سے کذب و افترا کے دفاتر کو کاٹ کے رکھ دیا۔ وہ ماضی اسلام کے ثناء خوان تھے ۔ وہ سطوت اسلام کو زندہ کرنا چاہتے تھے مگر محض

نعرے بازی سے نہیں ٹھوس علمی کارناموں اور منطقی دلائل کے ساتھ۔ اسلوب ان کا گو جذباتی جوشیلا' اور شاعرانہ ہے۔ مگر موضوع و مواد مستند و مدلل۔ وہ احیائے ملی کے اہم فریضے کے لئے تاریخ اور ماضی کو استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ وہ مقصد جلائے مستقبل تھا۔ وہ دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھا۔ وہ اپنے ماضی سے محبت اور تفاخر کے جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ و متعصب و تنگ نظر ہر گز نہ تھے۔ بلکہ اسلامی رواداری' وسیع القلبی اور عالف ظرفی کی عمدہ مثال تھے غیر مسلم مورخین کے استرداد کے لئے انہوں نے مسلم تاریخ دانوں کو سند کے طور پر نہیں استعمال کیا بلکہ ان کے استرداد کے لئے غیر مسلم محققین کی آراء کو پیش کیا۔ ان کے مضامین اور تصانیف معلومات دلائل اور حقائق کا بیش بہا خزانہ ہوتی ہیں وہ عقلیت کی کورانہ تقلید کے قائل نہ تھے۔ وہ عقل کو عشق کی جگہ دینے پر راضی نہ تھے۔

علامہ شبلی مسلمانوں کی عظمت پارینہ کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ وہ نثر میں وہ کام کر گئے جو علامہ اقبال شاعری کے ذریعے کرنے کے خواہاں تھے۔ علامہ شبلی نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو نثر میں استعمال کیا اور اپنی شاعری کو پس پشت ڈال کر اپنے جلیل القدر تاریخی کارناموں کی تخلیق میں مصروف رہے۔ شبلی کی تصانیف نثری ادب کے وہ سنگ گراں ہیں جن کی قدر و قیمت تاریخ و تخلیق کے میدانوں میں ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ علامہ شبلی بلند پایہ مورخ' تبصرہ نگار اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ بعض نقاد ان کی مورخانہ حیثیت کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی نگاہ میں ان کا جذباتی انداز بیان اور انتہا پسندانہ رویہ انہیں غیر جانبدرانہ مورخ بننے نہیں دیتا۔ یہ بات کسی حد تک

درست بھی مانی جا سکتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی جذباتیت و انتہا پسندی کے باوجود ان کی تاریخ دانی سے انکار ممکن نہیں۔

وہ گبن اور کار لائل کی طرح پورے دور کے سماجی' تہذیبی' سیاسی اور عمرانی حالات واقعات کی تصور دکھانے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ گبن ہی کی مانند تاریخ کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ جانتے تھے تاریخ کے ذکر میں ابن خلدون کی مانند آب و ہوا تک کا تذکرہ کرتے ہیں وہ کار لائل کی مانند چند تاریخی ناموں کے حوالے سے پوری تاریخ کا جائزہ لینے کا فن جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاروق حضرت عمرؓ کی سوانح حیات سے زیادہ دور خلافت کی بھی بھرپور تاریخ ہے۔ ان کا نظریہ بین الاقوامی تھا۔ وہ عام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کے ارکان جانتے تھے۔ وہ بھرپور تاریخی شعور کے مالک تھے۔ وہ تاریخ کو انشاپردازی نہیں فلسفہ سمجھتے تھے اور اسی فلسفہ تاریخ کو سائنس کے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔ پھر شاعر اور ادیب ہونے کے ناطے سے شخصیت نگاری اور مرقع کشی میں دوسرے تمام مورخوں سے سبقت لے جاتے تھے۔

خالص تاریخ کی انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ شعر العجم شاعری کی تاریخ ہے عوامی تاریخی نہیں۔ البتہ ان کی ہر تحریر کے اندر تاریخ قدم قدم پر چلتی ہے۔ وہ تاریخ جو صداقت' حقیقت' ماضی حوالے' ثبوت اور دلائل سے عبارت ہے ان کی تاریخ شخصیتوں کے محور پر گھومتی ہے اور شخصیت تحقیق و منطق کے محور پر گھومتی ہے وہ ہر بات تحقیق و منطق کی سان پر چڑھا کر اور چھان پھٹک کر کہتے ہیں۔ بلا ثبوت انہوں نے کوئی بات نہیں کہی ہر دعویٰ منطقی' علمی اور شواہد کے ٹھوس حوالوں کے ساتھ کہی ہے۔ شبلی تاریخ کا رشتہ تحقیق

اور تخلیق دونوں سے جوڑتے ہیں۔ تاریخ لکھتے وقت تحقیق سچائی کی ضامن اور تخلیق زندگی اور حرارت کی نمائندہ ہوتی ہے۔ شبلی نے دونوں سے کام لیا ہے۔ اور ماضی کے دریچوں کو بڑی فراخدلی سے وا کیا ہے حقائق کا بلا کم و کاست بیان ان کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ شبلی کا المیہ ہے کہ شاعری ان کے پاؤں کی زنجیر بنی رہی۔ ان کی شاعری کو ان کی تاریخ و تحقیق نے ڈبویا تو ان کی تاریخ و تحقیق ان کی شاعری نے کم معیار بنا دیا۔

شبلی بلاشبہ حالی کے شانہ بشانہ اردو کے عظیم ترین سوانح نگار ہیں۔ فنی اعتبار سے بعض حیثیتوں میں گو ان کو سوانح عمریاں حالی کے مقابلے میں بہتر نہ سمجھی جائیں۔ مگر موضوع، مواد، اسلوب کے لحاظ سے ان کی سوانح عمریاں اردو کی سب سے بلند پایہ سوانحی کارنامے ہیں۔ شبلی نے کسی معاصر کی سوانح نہیں لکھی۔ حالی کی حیات جاوید کو وہ مدلل مداحی قرار دیتے ہیں۔ سوانح کا فن ایک کٹھن کام ہے جس کے لئے اپنی ذات کو مغلوب کرنا پڑتا ہے۔ حالی اپنی شخصیت کو مغلوب کرسکتے تھے مگر شبلی کے لئے ایسا ممکن نہ تھا۔ اسی لئے سوانح کے لئے کسی معاصر کا انتخاب نہیں کیا بلکہ تاریخ اسلام کی ایسی برگزیدہ ہستیوں کو چنا جن کے سامنے ہمارے سر، ہماری زندگیاں اور ہماری روحیں پہلے ہی عقیدت و احترام سے جھکی ہوئی ہیں۔ سیرۃ النبی سرکار دو عالمؐ کی حیات مقدس کے بارے میں ہے۔ الفاروق حضرت عمر فاروقؓ، سیرۃ النعمان حضرت امام ابو حنیفہ، الغزالی حضرات امام غزالی اور سیرۃ مولانا روم حضرت مولانا روم کی سوانح حیات ہیں۔ ایسی ہستیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے شبلی کے لئے کسی شخصی تصادم یا اس قسم کا مسئلہ پیدا ہونا ممکن تھا۔ پھر شبلی کی ان سوانح عمریوں میں

تاریخی عنصر زیادہ اور شخصی عنصر کم ہے۔
شبلی کے موضوعات ان کے ذاتی یا شخصی نہیں بلکہ ان کے موضوعات کائناتی عظمت و وسعت کے حامل ہیں۔ ان سوانح عمریوں میں شبلی نے تحریر کی جادو بیانی کے وہ چراغ جلائے ہیں کہ رہتی دنیا تک یہ نقش قائم رہیں گے۔ پورے عربی ادب میں المامون' الفاروق۔ سیرۃ النعمان اور الغزالی جیسی کتب آج تک دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ الفاروق دنیا میں حضرت عمرؓ فاروق پر سب سے بلند پایہ تصنیف ہے۔ سیرۃ مولانا روم اور شعراء العجم کا جواب فارسی ادب آج تک مہیا نہیں کر سکا ہے۔ اور موازنہ انیس و دبیر سے بڑھ کر تصنیف شبلی کے بعد اردو ادب میں کوئی نہیں پیش کر سکا۔ اپنے اپنے فیلڈ میں ان کتابوں کا کوئی ثانی نہیں۔ سیرۃ النبی شبلی کا وہ کارنامہ ہے جس پر شبلی کیا اردو زبان اور مسلمان قوم ہمیشہ نازاں رہے گی۔ یہی شبلی کا زادراہ ہے اس کا جواب دنیا کی تاریخ میں ملنا محال ہے شبلی اسی کام کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی کے لئے زندہ تھے۔ اس کام کی تیاری وہ بہت عرصے سے کر رہے تھے۔ اس سمندر میں اترنے کے لئے اپنے بادبانوں کو پیوند لگا رہے تھے۔ سامان اکٹھا کر رہے تھے۔ پاؤں کٹ گیا تھا بڑھاپا آگیا تھا۔ ایک آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا۔ بینائی ختم ہو رہی تھی۔ لیکن شبلی اس بڑے کام کو کرنا چاہتے تھے جو درحقیقت ان کی شان کے شایان تھا۔ وہ خود کہتے ہیں۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

چودہ سو سالوں سے خاتم المرسلین کی سیرت پاک پر لکھنے والے لکھتے آرہے ہیں۔ اور ابد تک لکھتے رہیں گے۔ ہر زبان اور قوم نے سیرۃ النبی لکھی۔ اس مقدس کام کے لئے ادارے اور اکیڈمیاں قائم ہیں۔ مگر اکیلے شبلی نے جو کارنامہ کر دکھایا۔ اس کا جواب نہیں۔ شبلی نے اس بحر ذخار میں اپنی شکستہ ناؤ کو اتارا اور تن تنہا اسے پار کر گئے۔ شبلی نے پہلی دو جلدیں تحریر کی تھیں کہ بلاوا آیا اور وہ وفات پا گئے۔ مرتے وقت اپنے شاگرد رشید سلیمان ندوی کا ہاتھ پکڑ کر اور باچشم تر یہ وصیت کی سارے کام چھوڑ کر اس تصنیف کو مکمل کیا جائے۔ چنانچہ سید سلیمان نے چند ہی برسوں میں مزید چار جلدیں استاد کی ہدایت و رہنمائی کے مطابق لکھ کر اس عظیم سیرۃ کو چھ جلدوں میں مکمل کر کے مسلمان عالم پر احسان عظیم کر دیا۔ اس سیرت کا نچوڑ علامہ شبلی کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی پہلی دو جلدیں ہیں۔ یہ سیرت دنیا کی سیرتوں میں اعلیٰ ترین مقام کی حامل ہے۔ اس کا ثانی دنیا کی کوئی زبان پیش نہیں کر سکتی۔ اردو زبان دنیا کی ہر زبان کے سامنے یہ سیرت لا کہہ سکتی ہے کہ لاؤ اس کا مقابل۔ مگر اس کا کوئی مقابل نہیں۔ یہ شبلی کا لازوال علمی و تاریخی کارنامہ ہے جو شبلی کو شہرت عام کے ساتھ بقائے دوام بھی دلانے کی ضمانت ہے۔ اسی تصنیف میں بعثت رسولؐ کو ظہور قدسی کے عنوان سے اس قدر خوبصورتی' فرط عقیدت اور شاعرانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کہ یہ اب اردو نثر کا روشن ترین اور حسین ترین نمونہ کہلاتا ہے۔

علامہ شبلی نے اردو تنقید کے دامن کو بھی اپنی تحریروں کے ذریعے مالا مال

کیا۔ فارسی زبان و ادب کے بارے میں ان کی مایہ ناز تصنیف شعراء العجم پانچ جلدوں میں لکھی گئی۔ اس تاریخ میں انہوں نے فارسی شعرادب کے مختلف ادوار کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور ہر دور کی خصوصیات اور ہر شاعری کی انفرادی کمالات کا بڑا خوبصورتی سے جائزہ لیا۔ اس میں وہ مورخانہ صداقت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ ذوق سے بھی وہ بھرپور کام لیتے ہیں۔ ان کے محاکے اور آراء سند کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ اور پھر ماحول اور تاریخی و جغرافیائی پس منظر ان کی تنقیدی تحریروں کو اور زیادہ بنا جاندار دیتے ہیں۔ شبلی ہر تصنیف میں اس صنف کے اصولی اور نظری پہلوؤں پر بڑی صداقت کے ساتھ بحث کرتے ہیں اور صنف کے تاریخی ارتقاء کو منطقی روابط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ تنقیدی جوہر پارے ان کی تحریروں میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ شعراء العجم تو ہے ہی خالص تنقیدی تاریخ کی کتاب۔ سیرۃ مولانا روم میں مولانا کی شاعری کے حوالے سے نظری عملی تنقید کے عمدہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو مولانا روم کی شاعری اور فن کو سمجھنے مین بڑی مدد دیتے ہیں اس کے علاوہ ان کے مقامات میں بھی تنقیدی مواد جگہ جگہ ملتا ہے۔

موانہ انیس ودبیر ان کا خالص تنقیدی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے عملی تنقید کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے دبیر کو پچھاڑ کر انیس کو فلک مرثیہ کے آسمان تک پہنچایا۔ حالانکہ ہر تنقیدی پیمانے سے انیس دبیر سے برتر مرثیہ گو ہیں۔ مگر شبلی نے ایسا کلماڑا استعمال کیا ہے دبیر کو تحت الثریٰ تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شبلی کا فیصلہ ادبی تاریخ کا ناگزیر اور متفقہ فیصلہ ہے مگر اس کے لئے شبلی نے تخریب کارانہ تاثراتی تنقید کا سہارا لیا

اور انیس کی تقریظ اور دبیر کی تنقیص کے فرائض سر انجام دیئے۔ ان کی تنقید غیر متوازن جانبدرانہ اور جارحانہ ہے ان کے پاس ڈاکٹر کا نشتر نہیں قصاب کا چھرا ہے جو وہ اپنے مخالف کے سینے میں بے خوفی سے گھونپ دیتے ہیں۔

شبلی اردو میں جمالیاتی تنقید کے موجد ہیں وہ اپنی تنقید میں رومانیت، جذباتیت اور تخیل سے کام لیتے ہیں ان کے فیصلے شاذ ہی غلط ہوتے ہیں مگر فریق ثانی کے ساتھ سخت ناانصافی اور اس کی توہین بہرحال ہو جاتی ہے اس لئے تنقید بے لاگ نہیں رہتی۔ ان کی تنقید انصاف کا عدل جہانگیر نہیں مطلق العنان بادشاہ کی دادو دہش اور قہر غضب ہے اور اس میں ذاتی پسند و ناپسند کا بڑا دخل رہتا ہے۔ 'تنقید تنقیص' تقریظ' تخریب' تعزیر' تحقیر اور توہین کے درجے تک جا پہنچتی ہے ان حقائق کے باوصف موازنہ انیس و دبیر جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کی ایک شاندار مثال اور انیس و دبیر کے قضیے پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ علامہ شبلی نے انیس کا جو انتخاب اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ جمالیاتی اور فنکارانہ اعتبار سے مثالی ہے۔ علامہ شبلی کے پاس وقت کم اور کام بہت زیادہ تھے ورنہ وہ اپنے منصوبے کے مطابق شعرا لعجم کے بعد شعرو عرب اور پھر شعر الہند ضرور لکھ جاتے اور اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں ایک گرانقدر تصنیف کا اضافہ ہو جاتا۔

فلسفہ

علامہ شبلی نے فلسفیانہ موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور منطق و کلا کے موضوع پر الکلام اور علم الکلام کے نام سے دو تصانیف ضبط تحریر میں لائے'

اس کے علاوہ فلسفی مفکر امام غزالی پر ان کی کتاب الغزالی میں بھی فلسفیانہ مباحث تفصیل سے موجود ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ علامہ شبلی مزاج و مہناج کے اعتبار سے کسی فلسفی سے کم نہ تھے۔ ان کی تحریر میں فلسفیانہ موشگافیاں اور منطقی استدلال بہت ملتا ہے۔ پھر وہ اپنی تصانیف میں فلسفہ' تاریخ' سوانح' سیرۃ اور تنقید کے اصولوں پر مفصل بحث کرتے ہیں ان کے اسلوب کی گھمبیر علمیت اور منطقیت پر فلسفیانہ قطعیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ علامہ شبلی تاریخ و تحقیق اور ادب و شعر کے میدانوں میں نہ اترتے تو وہ بھرپور فلسفی ہوتے۔

شاعری

علامہ شبلی شاعر بھی تھے گو وہ شاعری کی طرف توجہ نہ دے سکے اس کے باوجود انہوں نے جدید شاعری کے رجحانات سے متاثر ہو کر کچھ نظمیں تخلیق کی ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ شاعری کی طرف بھرپور توجہ دیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس میدان میں کارہائے نمایاں سر انجام نہ دے جاتے۔ ان میں بھرپور شاعرانہ صلاحیت موجود تھی۔ جن کو وہ نثر میں تو برت سکے مگر شعر کے اپنے سانچے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انہوں نے تاریخ و تحقیق کی قربان گاہ پر اپنی شاعری کو بھینٹ چڑھا دیا۔ انہوں نے مشکل زمینوں کا انتخاب کیا مگر انہیں ہموار کرتے رہ گئے۔ ان کی شاعری مقصدیت اور معنویت کے ساتھ ساتھ حسن بیان کی بھی عمدہ مثال ہے وہ شاعری کو اصلاح قوم کا ذریعہ سمجھتے تھے اور شاعری سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو علامہ اقبال کے پیش نظر تھا۔ جذبہ' تخیل' لہجہ' زبان اور فکر کی موجودگی میں وہ پر تجمل شاعری

کرنے کے اہل تھے مگر انہیں موقع نہ مل سکا اور اردو ادب ایک اور حالی یا ظفر علی خاں سے محروم رہ گیا۔

مقالہ نگاری

علامہ شبلی کی ایک اور حیثیت اردو کے سب سے بڑے مقالہ نگار کی ہے۔ مقالے کا فن تو گویا شبلی کی تخلیق تھا۔ انہوں نے فن مقالہ نگاری کو اردو زبان میں بام عروج تک پہنچایا۔ مقالہ ہر الٹی سیدھی تحریر کو نہیں کہتے جیسا کہ آج کل رواج سا بن گیا ہے۔ اس قسم کی تحریروں کو مضمون یا ایسے (Essay) تو کہہ سکتے ہیں مقالہ نہیں' مقالہ ترجمہ ہے انگریزی صنف تھیس (Thesis) کا اور اس صنف کو شبلی نے علمی' تاریخی اور تحقیقی موضوعات کے لئے بڑی مہارت سے استعمال کیا۔ مقالہ سنجیدہ عملی' منطقی اور مفصل تحریر کا نام ہے جس کا آغاز دعویٰ' دلیل' نفس مضمون اور انجام ہوتا ہے اور ارتقائی انداز میں نظم و ضبط کے ساتھ تحریر میں آتا ہے۔ مقالے کے لئے کسی بھی موضوع پر پہلے سے موجود مکمل مواد کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ فرسودہ اور غیرپسندیدہ دعاوی کو مسترد اور نئے مثبت دعوؤں کو دلائل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

مقالہ حوالے اور سند مانگتا ہے شبلی کے مقالات مقالے کی ان تمام تعریفوں پر پورے اترتے ہیں ان کے بعض مقالات تو اس قدر جامع ہیں کہ ان کو آزاد تصنیف کا درجہ مل سکتا ہے۔ ایسے مقالے سو سو دو دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں جن میں سینکڑوں کتابوں کے حوالے موجود ہیں اور علامہ شبلی نے بلاشبہ سینکڑوں مقالات تاریخی' مذہبی اور ادبی موضوعات پر قلمبند کئے ہیں

جو متعدد جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مقالے کے ساتھ ساتھ علامہ شبلی نے بے شمار تبصرے بھی تحریر کئے ہیں اور اپنے زور قلم سے تبصرے کو فنی بلندی پر پہنچا دیا اس طرح وہ اردو کے بلند پایہ تبصرہ نگار قرار پاتے ہیں۔

علامہ شبلی کا مزاج شاعرانہ، جذباتی اور جوشیلا تھا ان کے مزاج کی یہ خصوصیت عطیہ کے نام خطوط میں بھی جھلکتی ہے اور بمبئی کے قصے بھی مشہور ہیں مگر یہ افسانے فنکاروں کی زندگی سے وابستہ چلے آتے ہیں۔ سلیمان ندوی اس واقعے کو بمبئی کی آب و ہوا سے متعلق محمول کرتے ہیں۔ علامہ شبلی مذہبی جوش و خروش بھی بہت رکھتے تھے ان میں رومانیت، نرگسیت اور خود نگری بھی بہت موجود تھی وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لانے والے تھے۔ مزاج کی تندی و تیزی کے سبب وہ تاریخ کے میدان میں بقول ناقدین ناکام رہے پھر سوانح نگاری کے شعبے میں بھی انکی انا ان کو بڑھنے سے روکتی رہی وہ انا کا سودا کسی جگہ نہ کر سکے۔ انتہا پسندی انہیں افراط و تفریط کی طرف لے جاتی رہی۔ تنقید کے میدان میں وہ جانبداری سے دامن نہ بچا سکے۔ شاعری کا پہلے ہی سودا ہو چکا تھا آخر شبلی کہاں کامیاب ہوئے۔ اس قسم کے فیصلے اس وقت ہوتے ہیں جب شخصیت کو خانوں میں بانٹ دیا جائے۔ شبلی مورخ، شبلی سوانح نگار، شبلی نقاد، شبلی شاعر۔ اگر شبلی کی شخصیت کو اپنی کلیت و جامعیت کے ساتھ سامنے لایا جائے تو کسی بھی شعبے میں ناکام نہیں ہوئے وہ اپنے دور کے سب سے بڑے فاضل اور عالم شخص تھے۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ تاریخ ادب کا لازوال سرمایہ ہے۔

علامہ شبلی موضوع و فکر سے ہٹ کر بھی خالص ادبی لحاظ سے غیر فانی

مقام کے حامل ہیں - وہ صاحب طرز انشاء پرداز اور نثر نگار تھے وہ اردو نثر کے عہد زریں کے صاحب طرز عناصر خمسہ میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے نثر کو ایک بانکا بجیلا اسلوب عطا کیا جو سرسید کی مقصد گزیدہ' حالی کی سپاٹ و ہموار آزاد کی مقفی و مسجع اور نذیر احمد کی محاورہ بند' نثر کے مقابلے میں زیادہ جاندار اور حسین اور پر مغز ہے۔ نئی نسل اور نئی نثر ان تمام ادیبوں کے مقابلے میں شبلی کے زیادہ قریب ہے۔ شبلی کی نثر بیک وقت قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔

یہ نثر صدیوں کی نثری روایت کو ساتھ لے کر چلتی ہے اسی لئے ان کے ہاں تصنع و بناوٹ کا احساس نہیں ملتا۔ شیفتگی' شگفتگی اور سنگھار ہے۔ ان کی نثر میں دھوپ کی تمازت اور چاندنی کی ٹھنڈک بیک وقت موجود ہے۔ وہ لفظوں کے سوداگر اور جوہری تھے۔ الفاظ کی صحیح قدر و قیمت سے واقف تھے۔ ان کی عبارت میں الفاظ کے خوش نما پیوند نہیں ملتے بلکہ الفاظ کا بر محل استعمال ہوتا ہے ان کے ہاں تکرار اور بھرمار نہیں۔ جچے تلے اور بھرپور فقرے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بھرپور معلومات ہوتی ہیں۔ شبلی کی تحریر دماغ کے ساتھ ساتھ دل کو بھی متاثر کرتی ہے - سرسید سکول کی عمومی خصوصیات' جدیدیت' مقصدیت' سلاست اور انگریزی الفاظ کے ساتھ ساتھ شبلی کے ہاں شاعرانہ حسن بیان خطیبانہ جوش بیان' ایجاز و اختصار' منطقی استدلال اور عالمانہ شان کی انفرادی خصوصیات بھی ملتی ہے۔

ان کے اسلوب میں راجپوتی آن بان بھی جھلکتی ہے ان کی تحریروں سے علمی تبحر' تبختر اور تدبر کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے ہاں بلا کی خود اعتمادی پائی جاتی

ہے۔ وہ مبہوت کن تحریروں کے مالک تھے۔ زور اور جوش ایسا کہ جو سامنے آئے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے ۔ ان کی تحریر ان کی اپنی شخصیت کا مکمل آئینہ ہے۔ وہ جلد بھڑک اٹھنے والے طوفانی مزاج شخص تھے۔ تحمل و بردباری سے دور۔ بھڑکے کاٹنے پر بلبلا اٹھنے والے شبلی کی تحریر بھی شعلہ جوالہ ہے مگراس ہیجان انگیزی کے باوصف جو لکھتے ضبط و تنظیم کے ساتھ لکھتے۔ بنا کر سنوار کر نکھار کر خوشبوؤں میں گوندھ کر لکھتے۔ انہیں اپنی برتری کا اس قدر احساس تھا۔ کہ وہ اپنے مخاطب کو اپنی تحریروں میں تم کہہ کر مخاطب کرتے۔

عربی فارسی، اسلامی تاریخ و تمدن، قرآن، احادیث و فقہ پر انہیں کامل عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی تحریر پر ان علوم اسلامیہ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اشعار کا بھی برمحل استعمال جا بجا ہے۔ انگریزی الفاظ و افکار کا بھی ذکر ہے۔ مگران کی تحریر میں وہی بے ساختگی ملتی ہے جو اشعار کی آمد میں ملتی ہے۔

انہوں نے اگرچہ آزاد کی طرح الفاظ کے طوطے مینا نہیں اڑائے مگر پھر بھی انہوں نے نثر کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے شاعرانہ وسیلوں سے بھرپور کام لیا۔ ان کے ہاں تشبیہات استعارات اور تمثیل کا رنگ بھی ملتا ہے۔ اور صنائع بدائع کا استعمال بھی جگہ جگہ ہوتا نظر آتا ہے۔ غرض ان کی نثر و فصاحت و بلاغت کی عمدہ تصویر ہے جو ہر موضوع و مواد کو یکساں توانائی کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شبلی نے فلسفیانہ اور سائنسی موضوعات کے لئے اردو زبان و بے ساختگی سے برت کراس کی اہمیت و افادیت کو ثابت کیا ہے۔ غرض اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی شبلی ممتاز ترین شخصیت قرار پاتے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی

سرسید احمد خان کے نامور رفقاء میں مولانا حالی کا نام سرفہرست ہے۔ حالی کبھی ہار نہ ماننے والے سپاہی کی مانند زندگی بھر عمل و ادب کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ سرسید کے عظیم اصلاحی مشن کو آگے بڑھانے میں انہوں نے بھرپور حصہ یا۔ سرسید عالم و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی مسائل میں الجھے رہے۔ انہیں یک سوئی اور فراغ میسر نہیں آسکا۔ جو علم و ادب کے کارناموں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ حالی بڑی حد تک ان جھمیلوں سے آزاد رہے۔ وہ مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ کم گو' صاف ذہن اور سادہ مزاج شخص تھے۔ سادگی و خلوص ان کی شخصیت و فن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ تصنع و بناوٹ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دل ہمدردی سے معمور پایا تھا۔ دوسروں کے دکھ میں شریک ہونے کا جذبہ فطرت کے اندر موجود تھا۔ کسی جانور کو ایذاء کے منظر سے بھی ملول و رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ وضعداری ان کی شان تھی۔ اسی وضعداری کو اپنے مفلر کی طرح سے زندگی بھر گلے سے لپیٹے رہے ان کی شخصیت بڑی اثر پذیر تھی۔ وہ دوسروں کے اثرات بہت جلد قبول کر لیتے

تھے۔ جس بڑی شخصیت سے وابستہ رہے اس کا اثر لیا۔ وہ مرعوب کن نہیں مرعوب ہو جانے والے شخص تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے عملی ادبی کارنامے ایک جہاں کو مرعوب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر شخصی اعتبار سے وہ بلند آہنگ زرو دار اور دیو قامت شخصیتوں سے بے اندازہ اثر پذیر ہو جاتے تھے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں غالب کی شاگردی نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی مصاحبت اور سر سید احمد خان کی رفاقت میسر رہی۔ ان تین ادبی شخصیتوں نے ان کی اپنی شخصیت کے خدو خال نمایاں کرنے میں اہم حصہ لیا۔ غالب سے ان کے قصائد پڑھے۔ غالب کی جدت طرازی اور ادبی شان ان کے فن و فکر میں جھلکتی نظر آتی ہے ۔ نواب شیفتہ کی سادگی خلوص اور صداقت ان کی تحریروں میں قدم قدم پر ہوتی ہے۔ سر سید نے حالی کو حالی بنایا۔ وہ حالی جسے ہم آپ اور ایک دنیا آسمان ادب کے روشن ترین ستارے کی صورت میں جانتے ہیں۔ حالی کی تحریروں کی معنویت' مقصدیت' خلوص و صداقت 'بے ساختگی' نیچرل اسلوب سر سید کے رہین منت ہیں۔ انگریزی زبان و ادب' فکر و خیال اور تہذیب و تمدن سے بھی حالی بہت متاثر تھے۔ سر سید کے اثر نے اس کو تیز تر کر دیا۔ حالی کچھ عرصہ پنجاب حکومت کے شعبہ تعلیم سے بھی وابستہ رہے وہاں انہیں انگریزی سے ترجمہ شدہ کتابوں کی تصحیح کا کام ملا۔ چنانچہ اس طرح انہیں انگریزی خیالات و نظریات نے بالواسطہ واقفیت کا موقع ملا۔ اس مطالعے میں گہرائی نہ تھی۔ مگر اس دور کے حالات کے مطابق یہ تعارف بھی

حالی کے انداز فکر کو کافی متاثر کر گیا۔ ان کی تحریروں کے ظاہر باطن دونوں پر انگریزی فکر و اسلوب کی چھاپ ملتی ہے وہ جا بہ جا انگریزی الفاظ میں اپنی تحریروں میں استعمال کرتے نظر آتے ہیں

جدید فکر و نظریات اور معاصر فضلاء کے اثرات کے باوجود حالی بنیادی طور پر ایک مشرقی ادیب تھے۔ مشرقیت ان کی شخصیت و فن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ انہوں نے مروجہ مشرقی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور عربی فارسی میں درک رکھتے تھے۔ مشرقی کلاسیکی ادب میں اگر کسی شخص کا سب سے زیادہ اثر انہوں نے قبول کیا تو وہ شیخ سعدی تھے۔ حالی و سعدی کی شخصیتوں میں بھی بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں شریف النفس، مسکین طبع۔ بامروت و باحیا اور تصنع و بناوٹ سے بے نیاز بلند کردار شخص تھے۔ دونوں نظم و نثر کے میدان کے شیر تھے۔ دونوں مصلحانہ ذہن رکھتے تھے۔ اور دونوں کی تحریروں کا جوہر اخلاقیات تھا۔ اس طرح سعدی ان کے روحانی استاد ٹھہرے جن کا مزاج و منہاج ان کی شخصیت و فن دونوں میں حلول کر گیا۔ اس طرح اردو ادب میں ایک رفیع الشان مگر منکسر مزاج ادیب و شاعر کا روپ سامنے آیا۔

اردو کا شاید ہی کوئی ادیب خالص ادبی خدمات میں حالی کی برابری کر سکے۔ سر سید بھی جو تحریک اصلاح کے سرخیل اور بلند پایہ ادیب تھے۔ اتنی متنوع ادبی خدمات سر انجام نہ دے سکے، جتنی حالی نے اکیلے سر انجام دی ہیں۔ حالی کے متعلق بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ شعر و ادب کے جس میدان میں داخل

ہوں۔ وہاں حالی پہلے سے موجود نظر آتے ہیں۔ شبلی کے علم و فضل میں کلام نہیں۔ تحقیق و تاریخ میں معرکتہ الارا تصانیف سے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا۔ مگر شاعری کے میدان میں وہ بہت پیچھے رہے۔ محمد حسین آزاد ایک صاحب طرز ادیب و انشاء پرواز تھے۔ مگر وہ بھی تخیل و تمثیل کی دنیا سے باہر نہ آسکے۔ ڈپٹی نذیر احمد نثر کی دنیا کے ایک شعبے کہانی و ناول کے مردِ تھے۔ یہ حالی کی خوش نصیبی تھی کہ علم و ادب کے تمام شعبوں کی بھرپور خدمت کی توفیق ملی۔ حالی جو خود انتہائی سادہ اور یک رنگ طبعیت کے مالک تھے۔ ادب کے سب رنگ میدان میں متنوع ادبی کارناموں کے خالق بنے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی بوقلموں شخص میں اتنی صلاحیتوں کا اجتماع ہو۔ کہ وہ بیک وقت صف اول کا شاعر بھی ہو اور صاحب طرز و اسلوب نثر نگار بھی' پھر شاعری میں بھی جدید و قدیم دونوں انداز فکر پر قدرت رکھتا ہو' غزل لکھے تو استادوں کے ٹکر کی۔ نظم لکھے تو ایک نیا جہاں تخلیق کر جائے۔ نثر لکھے تو اس پائے کی کہ نئی اصناف اور نئے امکانات دریافت ہو جائیں۔ بعض اصناف ادب میں تو انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اور جتنی اولیات حالی کے حصے میں آئیں۔ اتنی شاید ہی ایک ادیب و شاعر کو میسر آسکی ہوں۔ جدید نثر کا آغاز حالی کے دور میں سر سید اور ان کے رفقاء کی مساعی سے ہوا۔ غالب کے خطوط نے جن امکانات کی نشاندہی کی سر سید نے شعوری کوششوں سے اسے بھرپور حقیقت بنا کر پیش کیا۔ اسی نثر کو حالی شبلی آزاد اور نذیر احمد نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایک

بھرپور تحریک بنا کر آگے بڑھایا۔ اس لئے اس دور کو اردو نثر کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں چند بہت بڑے ادیب اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی مایہ ناز تصانیف کے ذریعے دامن علم کو مالا مال کیا۔ حالی کا مقام ان عظیم نثر نگاروں میں بھی ممتاز ہے۔ دوسری طرف وہ اتنے بڑے شاعر تھے کہ اگر وہ صرف شاعری ہی کرتے اور نثر نہ لکھتے' تب بھی ان کے مرتبے و مقام میں کوئی فرق نہ پڑتا۔

حالی کی اولیات میں سوانح عمری خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ حالی سے پہلے اردو نثر میں یہ صنف نہ ہونے کے برابر تھی۔ اول تو کوئی باقاعدہ سوانح حیات تھی ہی نہیں۔ اور جو سوانحی مواد تذکروں اور تاریخوں میں ملتا تھا وہ سوانحی فن کے نقطہ نگاہ سے بے حقیقت تھا۔ حالی نے سوانح کے فن کا باقاعدہ آغاز کیا اور متعدد بلند پایہ سوانح عمریاں لکھ کر اس فن کو اپنے حین حیات اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا دیا۔ سوانح نگاری ایک مشکل فن ہے۔ یہ تلوار کی دھار ہے۔ جس پر محتاط ترین فنکار ہی چل کر دکھا سکتا ہے۔ اندھی محبت اور نفرت کرنے والا انتہا پسند ادیب سوانح نگار نہیں بن سکتا۔ تعصب جذبات' عقیدت کا اسیر شخص بھی اس تپتے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ الفاظ کے طوطے مینا اڑانے والا ادیب بھی اس کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ علاوہ ازیں بے تعلقی اور معاندانہ رویہ بھی اس فن میں مدد نہیں دے سکتا۔ سوانح لکھنے کے لئے صاحب سوانح سے مکمل تعارف' واقفیت اور وابستگی ضروری ہے۔ فرق صرف یہ ہے

کہ سوانح نگار اپنی شخصیت کو الگ رکھے۔ گو اسکی ذات ضرور اس میں ملوث ہو جائے گی۔ تاریخ میں شخصیات کا ذکر واقعات کے حوالے سے ہوتا ہے۔ مگر سوانح میں شخص کے حوالے سے تاریخ ماحول اور واقعات مذکور ہوتے ہیں۔ تاریخ اگر فوٹو گرافی کا فن ہے تو سوانح مصوری کا آرٹ ہے۔ مصور رنگ و قلم اور کینوس لے کر اپنے مقصود کی تلاش میں نکلتا ہے۔ مشاہدہ کرتا ہے۔ مقصود کو نظروں کے سامنے رکھتا ہے اس کی ایک ایک حرکت' زاویے' گوشے کو بنظر عمیق دیکھتا ہے۔ اس سے محبت و شیفتگی کا اظہار کرتا ہے۔ حالی کے سوانحی کارنامے حیات سعدی' حیات جاوید اور یادگار غالب اس فن کی دھوپ چھاؤں کے مختلف انداز پیش کرتے ہیں۔

حیات جاوید اردو کی سب سے پہلی باقاعدہ سوانح حیات ہونے کے ساتھ ساتھ اب تک اردو کی سب سے مکمل اور بلند پایہ سوانح عمری خیال کی جاتی ہے۔ اگرچہ علامہ شبلی نے اسے مدلل مداحی قرار دے کر رد کیا ہے۔ مگر یہ اعتراض سوانح حیات سے زیادہ صاحب سوانح سر سید احمد خان پر ہے۔ کیونکہ شبلی نے حالی کی دوسری سوانح کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ حالی نے اگر سرسید کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تو یہ ان کی فطری رحمدلی' ہمدردی اور سپردگی کی وجہ سے تھی۔ حالی چیر پھاڑ کرنے والے بے رحم جراح نہیں۔ وہ نرم خو اور مرہم رکھنے والے معالج تھے۔ حالی نے اپنے مخصوص دھیمے اور مروت آمیز انداز میں اختلاف رائے کا اظہار بھی کیا مگر بحیثیت مجموعی وہ سرسید کی

شخصیت کے حلقے میں اسیر تھے۔ سر سید حالی کے راہنما تھے۔ تو غالب استاد اور سعدی روحانی رہبر۔ اس لئے بھی ان کی تصانیف میں محبت و درگزر کا رنگ نمایاں ہے۔ حیات سعدی اور یادگار غالب سوانح حیات سے زیادہ عملی و ادبی تصانیف ہیں۔ حیات سعدی میں سعدی کے بارے میں جو سوانحی مواد اور علمی ادبی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس عظیم شاعر و مصلح پر تحقیق کے نئے امکانات روشن کرتا ہے۔ خود اہل فارس کو اعتراف ہے کہ سعدی پہ اس سے بہتر سوانح حیات تصنیف کرنا ایک مشکل امر ہے۔ یادگار غالب سوانحی اعتبار سے زیادہ بلند پایہ نہ سہی۔ غالب کو بحیثیت شاعر فن کار دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ایک جامع کوشش ضرور تھی۔ اس تصنیف کی ادبی قدر و قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ حالی کی یہ کتاب غالب پر حوالے کی مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ غالب پر کوئی بھی لکھنے والا اس کتاب کے بغیر آگے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہی حال سعدی اور سر سید پر لکھی جانے والی کتابوں کا ہے۔

اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد کی حیثیت سے بھی حالی کا درجہ بہت بلند ہے۔ حالی سے پہلے تنقید کا وجود تذکروں میں نظر آتا ہے۔ مگر یہ تنقید تقریظ یا تنقیص سے آگے نہیں جاتی۔ ذاتی پسند ناپسند کا بہت زیادہ دخل نظر آتا ہے۔ محمد حسین آزاد جیسا ادیب و عالم آب حیات جیسی کتاب میں مومن کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ حالی نے تنقید کی دنیا میں بھی انقلاب برپا کر دیا ان کے تنقیدی خیالات

ان کی سوانح عمریوں اور دوسری تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں مگر 1893ء میں انہوں نے ایک بڑا واضح قدم اٹھایا۔ انہوں نے اپنے کلیات کا ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا۔ جس میں اپنے تنقیدی خیالات کو صراحت کے ساتھ اور مربوط انداز میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس میں پہلی مرتبہ نظریاتی مباحث پیش کیے گئے۔ حالی کی شان یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں پہلی مرتبہ شاعری کی ماہیت اہمیت اور پس منظر کے بارے میں نظریاتی بحثیں کی ہیں۔ اس کے ساتھ علمی تنقید کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ تصنیف جو بعد میں مقدمہ شعرو شاعری کے نام سے الگ چھپ کر معرکتہ الارا تنقیدی تصنیف قرار پائی حالی کے تنقیدی شعور کا ارتقاء بھی پیش کرتی ہے اس میں شاعری کی عظمت و تاثیر کو مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ادب اور زندگی کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور ان کے باہمی ربط کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کے حوالے اور قوم کے عروج و زوال میں شعرو ادب کے اثرات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ادب و اخلاق کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے۔

وہ شاعری کے لئے سادگی، جوش و صداقت کو اہم گردانتے ہیں اور شاعر کو اصلاح و قوم و ملک کے عظیم فریضے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ مغربی افکار سے محدود واقفیت کے باوصف حالی نے مقدمہ میں مغربی و مشرقی خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے شعرو ادب میں موضوع و مواد دونوں کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اسلوب کی معجز سامانی کا ذکر کیا ہے موضوع کی رفعتوں کو

بیان کیا ہے۔ تنقید کی تعمیری صلاحیتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ کلیم الدین احمد حالی کی کائنات تنقید میں خیالات کو ماخوذ، نظر کو سطحی، فہم و ادراک کو معمولی، غور و فکر کو ناکافی، تمیز کو ادنیٰ اور دماغ کو اوسط قرار دیتے رہیں۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ حالی کا پھینکا ہوا پہلا پتھر اس سنگلاخ سرزمین کا سنگ میل ثابت ہوا، ان کی اولیت کا نقش تابندہ ہے اور وقت و مخالفت کا غبار اس کو دھندلا نہیں سکا۔ اولیت سے قطع نظر بھی حالی کا مقام بطور نقاد بجائے خود ممتاز و منفرد ہے۔ اعلیٰ تنقید کے لئے جس مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالی وہ فطرت کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ ان میں وہ منفیانہ سفا کی ذہن و قلب نہیں تھی جو دور جدید کے بعض دوسرے نقادوں میں پائی جاتی ہے۔ حالی ہمدرد و غمگسار مونس و معالج اور انسان دوست و وفا پیشہ شخص تھے۔ وہ ضد، نفرت، جوش، جذباتیت، انتہا پسندی اور تصنع و بناوٹ سے پاک تھے۔ وہ ٹھنڈے دماغ اور دھیمے مزاج کے مالک تھے۔ ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنے والے عجلت پسندی سے گریزاں انسان تھے۔ اس کے ساتھ ان کا سلوب ہموار، یکساں، غیر جذباتی اور معروضی خصوصیت کا حامل ہے۔ ان کی تحریر میں منطقی ربط بھی نمایاں ہے۔ شاعرانہ لوازمات کا کم سے کم استعمال ہے۔ تحریر رطب دیابس اور زیر و بم سے بھی پاک ہے۔ پھر وہ بلند پایہ نثر نگار، اعلیٰ غزل گو اور بے بدل نظم گو تھے۔ اس لئے شعر و ادب کا تجزیہ ان کے لئے کوئی عجیب یا فالتو بات نہ تھی۔ ان کی تربیت شعر و ادب کی فضا میں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کا ادبی ذوق بہت نکھرا ہوا

تھا۔ شعری کیفیات ان کے لئے حال تھیں قال نہ تھیں۔ ان کا ذوق انتخاب بھی ان کے ذوق شعری کی عمدہ مثال ہے یادگار غالب میں غالب کے اشعار کا انتخاب اس سلسلہ کی اہم مثال ہے۔ چنانچہ تنقید کے میدان میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

حالی جس جگہ گئے وہاں ایک داستان چھوڑ آئے۔ چنانچہ شاعری کی دنیا میں بھی ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ شاعری کی کلاسیکی روایت کو انہوں نے اپنے خوبصورت تغزل کے ذریعے آگے بڑھایا۔ ان کی غزل روایتی حسن و عشق کے موضوعات کے بیان کے باوصف ایک خوبصورت انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ جس میں تازگی، رعنائی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ یہ انداز قدیم رنگ سخن کا ہے۔ مگر جہاں وہ مقصدیت کی زد میں شعوری سادگی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ وہاں غزل کا حسن مرجاتا ہے۔ سادگی اور مقصد آفرینی نے دوسری اصناف کو تو کچھ دیا ہو۔ مگر غزل کو فائدہ نہیں پہنچایا ہے۔ غزل نثر طور سپاٹ اور بے رنگ بن گئی ہے۔ چنانچہ حالی کے ہاں جہاں بعض بہت خوبصورت غزلیں ملتی ہیں وہاں بالکل پھیکی، بے کیف، بے جان اور بدصورت غزلیں بھی ملتی ہیں۔ جن میں پیمانہ صرف غزل کا ہے۔ ورنہ غزل کی موسیقی، مٹھاس، رمزیت معنویت کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

شاعری کی دنیا میں حالی کا کارنامہ جدید شاعری کی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔ محمد حسین آزاد اور حالی کو جدید اردو شاعری کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے

1872ء کے بعد کرنل ہال رائیڈ کے ایماء پر لاہور میں شعوری سعی سے پہلی مرتبہ موضوعاتی شاعری کی ابتداء کی اور جدید موضوعاتی مشاعرں کی داغ بیل ڈالی۔ آزاد اور حالی نے جدید رنگ کے نظموں کے ذریعے نئ شاعری کے لئے راہ ہموار کی۔ انہوں نے ان موضوعات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ جن کا ذکر اس سے قبل شاعری میں ناپید تھا۔ دکنی دور کی شاعری اور نظیر اکبر آبادی کے علاوہ ان موضوعات کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔ حالی اور آزاد نے وطن موسم، آدمی اور دوسرے موضوعات کو شاعری میں پیش کیا۔ جس سے شاعری کا کینوس بہت وسیع ہو گیا۔ یہ دور مقصدیت کا دور تھا۔ سرسید نے ادب و شعر میں بھی رنگ پیدا کرنا چاہا۔ حالی بھی ادب کے افادی اور سماجی کردار کے قائل تھے۔ اور وہ اس کے ذریعے اصلاح قوم کا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ حالی شاعری کے انقلاب کے ذریعے معاشرے میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حالی نے اپنی شاعری کے ذریعے شاعری کی ان امکانات کی طرف اشارہ کیا۔ جن کی تکمیل علامہ اقبال نے کی۔

حالی کی مشہور زمانہ نظم مسدس مدو جزر اسلام جو مسدس حالی نے نام سے مشہور ہے۔ مسلمانوں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی۔ اس نظم نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ اس نظم کو جو شہرت و پذیرائی نصیب ہوئی وہ شایدی کسی دوسری کتاب کے حصے میں آئی ہو۔ اس کی سادہ سلیس زبان اور دلوں کو برمانے والا انداز عوام الناس سے بے پناہ مقبولیت

کا باعث بنا۔ تاریخ اسلام کے روشن ابواب کے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر اس میں بڑے دلدوز انداز میں ہوا تھا۔ لوگ پڑھ پڑھ کر خوش بھی ہوتے تھے اور روتے بھی تھے۔ طنزو تشنیع کے نشتر بھی تھے اور مرہم کے پھاہے بھی۔ سرسید احمد خان کی اس نظم کو اپنی نجات کا سامنا ذریعہ دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا ان سے پوچھے گا کہ تم نے دنیا میں کیا کیا تو وہ مسدس حالی پیش کریں گے اور ان کی بخشش ہو جائے گی۔ حالی اگر صرف یہی ایک مسدس لکھتے تب بھی وہ اردو کے صف اول کے شاعروں میں شمار ہوتے۔

اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی حالی کا شمار منفرد نثر نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو نثر کو ایک ایسا اسلوب عطا کیا جو خالص علمی، سائنسی اور ٹھوس موضوعات کی ادائیگی کے لئے بے حد موزوں ہے۔ حالی کی نثر سادگی سلاست ارو مقصدیت کے ساتھ ساتھ غیر جذباتی، معروضی اور سائنٹفک انداز لئے ہوئے ہے۔ حالی کا سٹائل ہموار یکساں اور رواں ہے۔ یہ بے رنگ و بے کیف بھی ہے۔ قطعی طور پر غیر شاعرانہ ہے اس میں خنکی اور سرد مہری بھی پائی جاتی ہے۔ گرمی گرمجوشی، تیزی، تندی، طراری، طنز، غضب ناکی نہیں۔ اس میں بعض اوقات بور کن حد تک سپاٹ پن پایا جاتا ہے۔ نثر میں حالی کا قلم نہ شگوفے کھلاتا ہے۔ نہ آنسو گراتا ہے۔ سرسید کی سوانح حیات میں سرسید کی موت پر بھی سوانح نگار حالی کا قلم آنسوؤں کے چند قطرے نہ گرا سکا۔ حالی کی تحریر روزمرہ کے مطابق دلی کی ٹکسالی زبان کی آئینہ دار ہے۔ خلوص اس کا

خاصہ ہے۔ مقصد اس کی شان ہے۔ اور مقصدیت اس کا گہنا۔ اس میں نہ سر سید کا جوشیلا پن ہے۔ نہ شبلی کی علمیت و شعریت اور نہ محمد حسین آزاد کی رنگیں بیانی۔ بس سیدھی قابل فہم، مفید کار آمد اور جامع نثر ہے۔ جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ آج کا دور حالی کی نثر کے زیادہ قریب ہے۔ سائنس فلسفہ تاریخ اور دوسرے سماجی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے حالی کی نثر ہی کام آسکتی ہے۔

حال کی اولیات میں مسائل نسواں کو اردو زبان میں پیش کرنے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حالی نے اپنی نظم و نثر میں عورتوں کے مسائل اور معاشرہ و سماج کی طرف سے ہونے والے مظالم کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔ حالی کی ہی یہ تحریک ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری کے ہاتھوں آگے بڑھی۔ اور آج ادب و شعر میں عورت کے حسن و جمال کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کے سماجی معاشی مسائل کا جو ذکر ہوتا ہے اس کا آغاز بھی حالی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ عورت کے ماں بہن بیٹی کے روپ کو حالی نے شعر و ادب کا موضوع بنایا۔ اس مختصر تحریر میں حالی ایسی جامع لاکمالات شخصیت کے فن و فکر کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ حالی ادب کے آسمان کے وہ روشن تارے ہیں۔ جو ہمیشہ روشن رہیں گے اور ہر جہت میں سفر کرنے والے مسافروں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی تحریک آزادی کی صف اول کے رہنما تھے۔ جن کی مساعی محنت اور قربانیوں نے اس خطہ ارض کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا آزادی کے گمنام سپاہی کی طرح مولانا نے نمود و نمائش اور صلہ و ستائش کے تصورات سے بے نیاز ہو کر حیات مستعار کے لمحے عروس وطن کے نام کر دیئے تھے۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا اور ارض وطن کو سامراجی آمریت کے تسلط سے آزاد کروانا ان کا مشن تھا۔ انہوں نے وطن کی بیڑیوں کو کاٹ کر اپنے جسم و جان کو پہنانے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے اردگرد اندھیرے طاری کر کے نگار وطن کے آنگن میں سویروں کو اچھال دیا۔ مولانا ایک نڈر' دلیر اور جری رہنما تھے۔ جن کی آواز اور للکار پر سامراج کی بے رحم قوتیں اپنے قلعہ بند محلات میں کانپ اٹھتی تھیں۔ دیکھنے میں کمزور' ناتواں اور غیر انقلابی سا انسان جو شعر و ادب اور اس کے کاروبار عشق میں بھی مبتلا رہتا تھا جب قومی سیاست کے افق پہ ارادہ و عزم کی قوتوں سے مسلح ہو کر جلوہ فگن ہوتا ہے تو دیکھنے والوں کو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ایک مرزا منش' شاعر نما' لرزتا کانپتا

شخص غیرت، ایمانی کی حرارت سے کس قدر توانا ہو جاتا ہے اس کا ادنیٰ سا نقشہ حسرت موہانی کی زندگی اور اس کے آثار احوال کا مطالعہ ہے کرنے سے سامنے آتا ہے۔

مولانا کی زندگی حیرت فروش جدوجہد کی انمٹ داستان ہے۔ بقول شخصے ان کی آدھی زندگی جیل میں تو آدھی ریل میں گزری۔ کوئی مہینہ کوئی سال ایسا نہ جاتا تھا۔ جب وہ جیل نہ گئے ہوں۔ ایک دری میں لپٹا تکیہ' ایک لوٹا' ایک چھتری ان کی کل کائنات تھی۔ اس کو لئے وہ زندگی اور اس کے بے پناہ مصائب کی ساری منزلیں طے کرتے رہے۔ شعلہ بیان مقرر تھے۔ آواز میں گونج اور بات میں کاٹ تھی۔ آزادی کے حصول کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ جب سٹیج پر کھڑے ہوتے تو اقتدار کے ایوانوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ آزادی کے پروانوں اور متوالوں کے اندر حرکت و حرارت کے چراغ روشن ہو جاتے۔ غلام ہندوستان کے اندر عمل کی بجلیاں بھر جاتیں۔ حلقہ بگوش سہمے ہوئے انسانوں کے وجود شعلہ بدست قوتوں میں ڈھل کر حکومت و حکمرانوں کی دیواروں سے سر ٹکرانے کے لئے تیار ہو جاتے۔ یہی بات استبدادی قوتوں کو کھٹکتی۔ پھر اس نحیف و نزار مسلمان سپہ سالار پر جورو جفا کے دروازے کھول دیئے جاتے۔ بغاوت و سرکشی کے مقدمے کھڑے کئے جاتے۔ قید و صعوبت کی کٹھنائیوں میں ڈالا جاتا۔ وہ دکھ سہتے سہتے زندگی کے دن گزاتے۔ مگر ہار نہ مانتے وہ اپنے وطن کے گرد پھیلے ہوئے لوہے کے جالوں کو اپنے تن کے گرد اوڑھ کر لمحہ آزادی کو

قریب سے قریب تر لانے میں کوشاں رہتے۔

مولانا حسرت موہانی انتہائی درجے کے سامراج دشمن تھے جو نو آبادیاتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ہر قوت سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار تھے۔ وہ اس مشن کو جنگ اور جہاد کا نام دیئے تھے۔ وہ مطالبوں قرار دادوں اور سیاسی داؤ پیچ سے زیادہ حریفان ستم کوش کو براہ راست سامنے آکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے دست وپا کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ وہ قوت کا توڑ قوت سے کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا لڑو اور لڑ کر جان دے دو۔ ان کے نزدیک آزادی کا راستہ آگ خاک اور خون میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ آزادی دی نہیں جاتی لی جاتی ہے۔ مانگی نہیں جاتی چھینی جاتی ہے۔ وہ وطن کی راہوں کو روشن رکھنے کے لئے اپنے تن کو سرو چراغان بنانے کی رسم شبیری پر عمل پیرا تھے۔ ان کے یہ خیالات آزادی کی آگ میں سلگتی خشک لکڑیوں پر تیل کا کام کرتے۔ چنانچہ اقتدار کے سنگھاسن ڈانواڈول ہونے لگتے۔ مولانا کو روکنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش بھی اس لئے کامیاب ہیں ہو سکتی تھی کہ ایک تو کوئی ان کہ منہ نہیں لگ سکتا تھا دوسرے وہ جس راہ پر رواں تھے اس سے روکنے یا رکنے کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

شہادت کے طلب گاروں کو حراست کہاں ڈرا سکتی ہے چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قید تنہائی میں پابہ جولاں ہو کر حیرت فکر کی تاریخ آہنی جھنکار کے نغموں سے رقم کرتے تھے۔ ان کال کوٹھریوں میں ان کو چکی بھی پیسنی پڑتی غم کھانے اور

اٹھانے پڑتے مگر پائے استقلال کو لغزش کی موج نصیب نہ ہوتی۔ وہ روتے نہ سوتے جھکتے نہ ڈرتے۔ کام میں لگے رہتے لکھتے لکھاتے رہتے۔ چنانچہ آلام دل زار کی نقشہ یوں بیان کیا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبعیت بھی

حسرت کی زندگی جیلوں کے وقفے میں گذری۔ جیل سے نکلے۔ بستر اٹھایا' لوٹا چھتری سنبھالی اور سفر پر نکل گئے۔ اب ریلوے کا تیسرے درجہ کا ڈبہ ان کا مسکن تھا۔ وہ شہر شہر نگر نگر گاؤں گاؤں پھرتے رہے' رکتے رہے' اپنا مشن' اپنی آواز پہنچاتے رہے چلتے رہے۔ پیدل چل چل کر پاؤں زخمی کر لئے۔ بول بول کر گلا بٹھا لیا۔ جس گاؤں میں پہنچے۔ کسی غریب دوست کی کٹیا میں رین بسیرا کر لیا۔ ایک پرانی میلی شیروانی ان کی دوست و رفیق تھی جس کو اکثر وہ خود ہی دھونے کا اہتمام کرتے تھے۔ کھانا ان کا سادہ اور انتہائی غریبانہ ہوتا تھا۔ ٹھہرنا وہیں جہاں رات آگئی۔ بس میں چلتے رہے بڑھتے رہے۔ جہاں چہل پہل یا سیاسی ریل پیل سے کچھ فراغت کے آثار نظر آتے وہیں اپنے رب دو جہاں اور آقائے نامدار کے دیاروں کی طرف چل پڑتے۔ حج کرنا ان کا شیوہ عادت اور پیشہ سا بن گیا تھا۔ ٹوٹی چھتری اٹھائی۔ نہ کسی کو بتایا نہ اعلان کیا' چپکے سے دیدار روضہ رسولؐ اور حج بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔

حسرت موہانی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے جتنی بڑی حیثیت ان کی

ایک سامراج دشمن قومی لیڈر کی ہے۔ اس سے بڑھ کو وہ تحریک آزادی اور پاکستان کے صف اول کے راہبر تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی خدمات کا ان کے شایان شان اعتراف ابھی نہیں کیا گیا۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ قائد اعظم اور ڈاکٹر اقبال کے پائے کے رہنما تھے۔ وہ اسی سطح پر جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ جس سطح پر محمد علی جوہر، شوکت علی، ظفر علی خان، ابو الکلام آزاد، اور عبد الغفار خان کو رکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک اجتماع اور انجمن تھے۔ ان کی قوت و توانائی، ان کا شخصی کردار عالی حوصلگی، بلند نگہی، آتش نمرود میں کود جانے کی صلاحیت و صلابت بے مثال تھی۔ انہیں کبھی کسی پارٹی گروہ یا طبقے کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود جہاں پہنچے وہاں داستان چھوڑ آئے۔ ان کے انفرادی حوصلے اور جولانی سے بڑے بڑے گروہوں کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔

حسرت موہانی کی ہفت پہلو شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی شاعرانہ عظمت و رفعت ہے۔ حسرت نہ صرف بلند پایہ شاعر ادیب تھے۔ بلکہ وہ ادب و شعر میں عہد ساز کردار بھی ادا کر چکے ہیں۔ وہ شاعری میں نسیم کے شاگرد تھے۔ اس طرح ان کا رشتہ امام المتغزلین حکیم مومن خان سے جا ملتا ہے۔ اس تغزل کی چھاپ اور پرتو ان کی شاعری پر آسانی سے نظر آ سکتی ہے۔ وہ اسی حوالے سے "رئیس المتغزلین" کہلانے کے بھی مستحق ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ صحافت کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑے ہیں۔ وہ کہنے کو

نسیم و مومن کے رنگ سخن سے متاثر ضرور تھے۔ مگر ان کے عالی حوصلہ مزاج نے کسی ایک استاد کا رنگ سخن پوری طرح اپنے اوپر نہیں چڑھنے دیا۔ وہ غالب میر' درد' سودا مصحفی' آتش' ناسخ مصحفی جیسے اساتذہ فن کے رنگوں کو قبول کر کے اپنے کلام معجز نظام گلدستہ صد رنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سب کا رنگ ملتا ہے۔ مگر ہر جگہ ان کی ذات کا کیمیائی عمل اس رنگ کو انفرادیت کی طرز نو بخش دیتا ہے۔

حسرت نے غزل کی صنف کو اس وقت سنبھالا دیا۔ جب جدید اثرات کے تحت اس کی ساکھ کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اور مولانا حالی جیسا غزل گو بھی اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرچکا تھا۔ حالی نے غزل میں سادگی اور مقصدیت کے نام پر ایسی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی جس سے غزل کا تغزل اور ترنم مجروح ہونے اندیشہ تھا۔ اس آبروئے ادب کی کشتی ڈانواں ڈول تھی۔ نئے لکھنے والے اس سے بددل ہو چکے تھے۔ نظم کا طوطی بولنے لگا۔ ایسے میں حسرت موہانی جیسے غزل گو آستینیں چڑھا کر غزل کے دفاع کے لئے سامنے آگئے انھوں نے اس میدان میں چومکھی لڑنے کا خوبصورت مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ایک تو خود خوب صورت معنی آفرین اور عصر جدید کے تقاضوں کے ہم آہنگ بلند پایہ غزلیں پیش کر کے غزل کے نئے امکانات کو روشن کیا۔ دوسرا انھوں نے صحافت کے میدان میں اس کے حق میں دلائل و براہین کے انبار لگا دیئے۔ انھوں نے ایک کام اور کیا۔ وہ یہ کہ کلاسیکی اساتذہ کی بلند پایہ غزلیات کا

انتخاب اپنے رسالے میں شائع کرنا شروع کیا۔ حسرت نے اپنے ذوق شاعری سے بھرپور کام لیتے ہوئے۔ اپنا پورا زور قلم و علم غزل کے دفاع اور اس کی بحالی پر صرف کردیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی عرصے میں غزل کے باب میں معذرت خواہانہ رویہ دم توڑنے لگا۔ اور غزل اپنی پوری آب و تاب سے پھر جلوہ گر ہونے لگی۔ اردو غزل حسرت کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حسرت کے ان صحافیانہ و محققانہ اقدامات سے قطع نظر بھی اگر دیکھا جائے تو وہ ذاتی طور پر اردو کے چند بہترین غزل گو شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کی کوئی تاریخ حسرت کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ حسرت کی شاعری میں حسن و عشق کی جو تصاویر پر ملتی ہیں۔ وہ زندگی کے بہت قریب ہیں۔ ان کے ہاں محبوب نہ میر کے محبوب کی طرح ماورائی مخلوق ہے نہ داغ کے محبوب کی طرح بازاری ہے۔ حسرت کا محبوب گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے۔ جس کا تعلق متوسط شریف گھرانوں سے ہے۔ ان کا عشق ان کی شاعری میں سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ حسرت کے انسانی عشق میں وصال' فراق' روٹھنے منّنے سبھی قسم کی کیفیات اپنی حسی لذتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ محبوب کے سراپے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں محبوب کا ظاہری جمال اپنی خوشبو' رنگ اور پسینے کے ساتھ دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ حسرت کے کلام کا ترنم اور موسیقیت مصرعوں میں جاگتی نظر آتی ہے۔ حسرت مقام و

منصب حسن و عشق دونوں سے آگاہ ہیں۔ ان کے عشق میں گناہ کا تصور نہیں۔ یہاں معصومیت پھول کھلاتی ہے۔ حسرت تعلقات عشق کی جو جزئیات دکھاتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ شرما کر پلو کو مروڑنا' دوپہر کو ننگے پاؤں کوٹھے پر آنا' ہاتھوں میں کنگن کو گھمانا اور عاشقی کے زمانے کی ٹھنڈی میٹھی مستانی یادیں اور ادائیں ان کے اشعار میں سے یوں جھانکتی ہیں۔ جیسے شفاف پانی میں سنہری رو پہلی مچھلیاں۔

ان کے اشعار میں عشق کی شاد کامی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ غم و الم ان کے اشعار میں کم ہی ملتا ہے۔ جہاں موجود بھی ہوتا ہے۔ وہاں اس میں یاس و نامرادی کا تصور کم اور میٹھی ٹیسوں کی باتیں زیادہ ہیں۔ کہتے ہیں ۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

حسرت یاس کے شاعر نہیں۔ ان کے ہاں رجائیت و طمانیت کا رنگ اشعار کی زیریں سطح پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ رنگ' خوشبو' طرب' آہنگ کی شاعری ہے جس میں حوصلہ فرسا ناکامیاں اور بے نام مایوسی حقیقی زندگی کو پابہ جولاں کرتی نظر نہیں آتیں۔ ان کے ہاں کوئی گہرا فلسفہ' بعید از حقائق دانشوری اور خارج گریز ماورائیت حسن و عشق کی مترنم فضاؤں کو بوجھل نہیں بناتی۔

بس یہاں زندگی کے سینے سے لگانے والا ایک سبک و شریں لہجہ محو خرام ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے اندر زندگی کا رس' رم اور روئیدگی بال و پر لہراتی ساحل عافیت پر اڑتی پھرتی ہے۔ حسرت کے ہاں محبت کی شیرینی جذبات کی پاکیزگی کے ساتھ مل کر ایک شائستہ آہنگ کو جنم دیتی ہے۔ ان کے ہاں بازاریت چھچھورا پن اور سوقیت نہیں۔ اور نہ ہی بیزاری جھنجھلاہٹ یا لاینحل کبیدگی کے گہرے سائے ہیں۔ بلکہ ان کی شاعری میں حیات مترنم لہروں پہ رواں ایک ساز طرب کے طور پر ابھرتی ہے۔ البتہ ایک بات اکثر و بیشتر ان کی شاعری کے مطالعے میں کھلتی ہے وہ یہ کہ سیاست' صحافت اور جیل میں پایا جانے والا حسرت اپنی شاعری کے متعدبہ حصے میں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح شعر و سخن کا رنگین مزاج رسیا اور محبوب کو گرم دوپہر میں ننگے پاؤں کوٹھے پر بلانے والا عاشق مزاج انسان جیل اور ریل کے جوکھوں میں اپنی جان کیوں کر ڈال سکا۔ یوں ذات و حیات کا ایک تضاد سا بھی ابھر کر سامنے آتا دکھائی دیتا ہے مگر حسرت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے مختلف خانوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ حسرت کے باعمل انسان' پاک باز' متقی انقلابی لیڈر ہونے کا چرچا قومی افق پہ ثبت نہ ہوتا۔ تو حسرت کی شاعری اور زندگی کے ان فاصلوں کو کئی اور معنی پہنا دیئے جاتے۔ مگر حسرت کے کردار کے اثبات اور ان کی ایثار پیشگی پر ان کا سخت سے سخت حریف بھی حرف لانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اور اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں کہ حسرت بہت بڑے انسان' شاعر اور تحریک

آزادی کے ایک جری جرنیل تھے جن کو نظر انداز کرنا تاریخ کے بس کی بات بھی نہیں۔

سائیں احمد علی

ہندکو زبان خیبر سے امرتسر تک کے وسیع علاقوں میں بولی سمجھی جاتی ہے بعض محقیقن نے اسے پنجابی زبان کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ ہندکو پنجابی کی شاخ ہو یا نہ ہو پنجابی زبان سے ملتی جلتی زبان ضرور ہے سرائیکی پوٹھواری اور لاہوری امرتسری زبان سے اس کی قربت داری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ہندکو کو برصغیر کے قدیم زبان بانوں میں سے ایک زبان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے یہ وہی زبان ہے جو برصغیر کی قدیم اور اصلی باشندے سے ہمیشہ سے بولتے آئے ہیں تحقیقی موشگافیوں کو چھوڑ کر اگر صرف عملی سطح پر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندکو اور اس کی ہم زاد رشتہ دار پنجابی زبان پاکستان کی سب سے زیادہ علاقوں کے سب سے زیادہ لوگوں کی مادری گھریلو اور روزمرہ بول چال کی زبان ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کے چھ کروڑ سے زیادہ باشندوں پنجابی اور ہندکو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ پنجابی اور ہندکو میں لہجے کی علاقائیت اور مقامیت کے فرق کے علاوہ بنیادی سڑکچر کا بعد نہیں ہے۔ اٹک کے اس پار اگر یہ زبان ہندکو کہلاتی ہے تو اس پار فطری فاصلاتی فرق کے سبب

کچھ روپ بدل کر پنجابی کا نام اختیار کر جاتی ہے۔ اس میدان میں ابھی مزید توسیع اور جامع تحقیق کی ضرورت ہے جس سے ہندکو پنجابی کے لسانی رشتوں کی یکسانیت اور یکجانیت کا فنی تحقیقی اور علمی سراغ زیادہ صراحت کے ساتھ لگایا جا سکے اور ہیئت کی مختلف تبدیلیوں کے لسانی تاریخی اور طبعیاتی عوامل و عناصر کی سامنے لا کر ہندکو کا مقام و مرتبہ متعین کیا جا سکے۔ صوبہ سرحد کے وسیع علاقوں میں ہندکو سمجھی جاتی ہے تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہزارہ ڈویژن میں ہندکو ہی اکثریت کی زبان ہے۔پشاور پتہ خالصہ کوہاٹ نوشہرہ اکوڑہ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقوں میں یہی ہندکو اور اس کے مختلف لسانی روپ بولے سمجھے جاتے ہیں۔ صوبہ سرحدی بلاشبہ پشتو کے بعد یہ دوسری بڑی زبان ہے مگر اس زبان کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ حکمران یا صاحب اقتدار لوگوں کی زبان کبھی نہیں رہی۔ درباری سرکاری سرپرستی اسے حاصل نہیں ہوئی۔ لنگوا فرینکا کا مقام و مرتبہ بھی اسے حاصل نہیں رہا۔ اس کے بولنے والوں شاعروں اور ادیبوں نے اسے ضبط تحریر سے دور رکھا اس کا ادب پروان نہیں چڑھ سکا۔ اس کے رسم الخط اور تحریری روپ کو فروغ نہیں مل سکا۔ اس کی وجوہات جو بھی ہوں اس کوتاہی کی بڑی ذمہ داری اس زبان کی لکھاڑیوں پر عائد ہوتی ہے۔ہندکو گو علاقوں پر بیرونی یلغار اور تسلط ہمیشہ قائم رہا لسانی لحاظ سے اس زبان کا تشخص ابھر کر سامنے نہ آ سکا۔ فارسی گو عساکر ہندکو علاقوں پر حکمران رہیں۔ حکمران کی زبان کا بول بالا رہا۔ پھر انگریز بہادر آیا۔ مقامی زبانوں کے اثرات الفاظ اصوات

اور لسانی روایات کو لے کر ایک نئی زبان اردو کا پھیلاؤ بہاؤ بڑھتا رہا۔ مقامی زبانیں اس زبان کو اپنا خون جگر اور دودھ پلاتی رہیں تانکہ یہ نوزائیدہ بچہ پل کر جوان ہو گیا ایک کمزور ماں کی طرح ہندکو دور پرے بیٹھ کر تماشا کرتی رہی۔ ہندکو میں زور نہیں تھا یا ماحول میں زیادہ توانائی تھی ہندکو ماؤں بچوں اور بوڑھوں کی زبانوں سے نکل کر کاغذ کے سینے پر سوار نہ ہو سکی۔ ان تمام عوامل پر تحقیقات کی ضرورت ہے ہندکو میں بڑے بڑے شاعر ابھرے ہیں جن کے نام کا ڈنکا اپنی وقت میں برصغیر میں کسی حد تک بجا بھی مگر یہ شہرت انفرادی کامیابی سے زیادہ درجہ نہیں رکھتی۔ ان لوگوں کو ملک گیر پذیرائی نہیں مل سکی۔

اس زبان کے شاعروں میں استاد رمزد بردا اور سائیں کا نام تاریخ کے صفحوں پر کبھی تو جگمگائے گا۔ اس زبان کے بولنے والے شاعر ادیب کبھی تو نفاق زدہ مفعولیت کے خول سے نکل کر اپنی مادری زبان کی تاریخ تصنیف تالیف کو چمکا کر منظر عام پر پیش کریں گے۔ ہندکو شاعری کی تاریخ میں سب سے زیادہ جگمگاتا نام احمد علی سائیں کا ہے جسے ناقدین فن نے ہندکو کا غالب کہا ہے۔ سائیں ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے اور علامہ اقبال کی وفات سے ایک سال قبل ۱۹۳۷ء میں فوت ہوئے لمبی عمر پائی اور ہندکو شاعری میں لمبے کارنامے سرانجام دیے وہ پشاور کے رہنے والے تھے ان کے والد فوج کے ٹھیکہ دار تھے اس لئے سائیں کو اپنے والد کی ساتھ زندگی کا زیادہ عرصہ پشاور سے باہر فوجی چھاؤنیوں کے آس پاس گزرنا پڑا۔ اس زمانے میں راولپنڈی میں افواج ہند کی بڑی چھاؤنی تھی۔ اس

لئے کاروبار کے سلسلے میں سائیں کو زندگی کا زیادہ حصہ روالپنڈی میں گزارنا پڑا
اس لئے پنڈی والوں کا کہنا ہے کہ سائیں ان کا شاعر ہے۔ پروفیسر کرم حیدری
نے سائیں کو پوٹھوہار کا شاعر قرار دیا ہے روالپنڈی میں ان کو گورمکھ سنگھ
المعروف مکھڑاں سنگھ کی رفاقت و مصاحبت کا ایک طویل عرصہ ملا جو علم دوست
اور ادب شناس شخص ہونے کے ناطے سائیں کا پرستار اور پکا یار تھا۔ مکھڑاں
سنگھ راجہ مہاراجہ تو نہ تھا البتہ راجوں جیسے ٹھاٹھ رکھتا تھا۔ وہ اپنا دربار سجاتا تھا
جس میں اپنے دور کے اہل علم و ادب حاضری دیتے بیٹھکیں جمتیں سرداروں
کے باغ میں شب وروز محفلیں سجتیں۔ اس برات کا شہ بالا سائیں احمد علی ہی
ہوا کرتا تھا۔ سائیں سے گورمکھ سنگھ کو اس قدر پیار تھا کہ وہ کسی طرح سائیں
کی جدائی گوارا نہیں کرتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق جب سائیں مرا تو گورمکھ
سنگھ جنازے کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ سائیں احمد علی سچا ان پڑھ
تھا مگر اس کو بڑے بڑے عالموں فاضلوں کی محفلوں میں بیٹھنے ان کی باتیں سننے
اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ ایک تو سفر خود وسیلہ ظفر ہوتا
ہے۔ وطن میں ان کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا کوچہ رسالدار کے زعما کے ساتھ تھا جو
پڑھے لکھے لوگ تھے۔ اور ادب و شعر کا شائستہ و شستہ ذوق رکھتے تھے پھر
سائیں قزلباش خاندان کے چشم و چراغ تھے جو بیشتر علم و ادب سے گہرا شغف
رکھتے ہیں ۔ ان کے گھروں میں فارسی زبان عام طور پر بولی جاتی تھی بلکہ اب
تک یہ روایت قائم ہے۔ سائیں گو رسمی تعلیم سے محروم رہے مگر علم کی پیاس

عمر کے آخری حصے تک بجھاتے رہے وہ خواندہ لوگوں سے کتابیں پڑھوا کر سنتے
تھے۔ یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ سنی بات بھی کبھی نہیں بھلاتے تھے
ان کے کلام و بیان میں اس قدر علمیت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض ناقدین اس بات
کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں کہ سائیں ان پڑھ محض تھے۔ دوسری
طرف سائیں کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر اوقات گفتگو اردو زبان میں بات کرتے
تھے۔ کیونکہ یہی پڑھے لکھے لوگوں کی شناخت تھی۔ انہوں نے اردو میں بے
شمار شعر بھی کہےاور بزم سخن اردو کی بنیاد بھی رکھی۔ ان کے فارسی اشعار کو
سن کر محسوس ہوتا ہے ان اشعار کا خالق سے کچھ ہو۔ ان پڑھ نہیں ہو سکتا
اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ وہ امی تھے اور خواندگی کے سلسلے
میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ البتہ استاد رمزو کی شاگردی
اختیار کی۔ وہ اپنا کلام ان کو دکھاتے رہے۔ یہ سلسلہ بھی عملی سے زیادہ رسمی
تھا۔ وہ بے استاد کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے استاد کی خدمت کو حاصل زندگی
جانتے تھے۔

سائیں ایک بھرپور زندگی گزار کر اس جہاں فانی سے رخصت ہوئے جن
لوگوں نے ان کو دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ سائیں اطوار و عادات چلت
پھرت لباس و حلیے میں لکھنؤ کے بانکوں کی طرح قدیم پشاوری انداز کی چلتی
پھرتی روایت تھے۔ استاد جگر کاظمی مرحوم کا کہنا ہے انہوں نے مرزا غلام حسین
مسگر کی دکان پر ایک چھوٹے قد کے ہلکے جسم کے بانکے سجیلے شخص کو دیکھا کہ

ہاتھ پر باز بٹھائے دوسرے ہاتھ میں ہنٹر گھما رہا ہے اور مشہدی لنگی ٹپکا' تلے دار
چپلیاں ٹکائے بڑی شان اور ٹھاٹھ سے شعر پڑھ رہا ہے قہقہے لگا رہا ہے یہی
شخص سائیں احمد علی تھا کہ جس کے شاگردوں کو پوری ایک فوج ان کے ساتھ
آگے پیچھے ہوتی تھی جب جو تبر لٹھ کمانی دار چاقوؤں سے لیس ہوتی تھی۔ استاد
جدھر سے گزرتا تھا۔ لوگ مڑ مڑ کر پشاور کے اس بانکے سجیلے شاعر کو دیکھا کرتے
تھے استاد بٹیربازی کے بھی بڑے شوقین تھے اگر ان کے ہاتھ باز نہ ہوتا تو بیٹر
ضروری ہوتا تھا۔ گھر میں اصیل مرغ بھی پال رکھے تھے بیٹر اور مرغ کی لمبی لمبی
بازیاں لگتیں تھیں۔ شعرو شاعری کے معرکے ہوتے تھے۔ بیت بازی کے
مقابلے ہوتے سچے سادہ اور معصوم زمانے تھے۔ دلوں میں اخلاص کے موجیں
مارتے سمندر تھے استاد سائیں اپنے گھر یہ یا دوستوں کی بیٹھکوں میں شعرو سخن
کی محفلیں سجاتے رہتے۔ جب تک پشار میں ہوتے توسلسلہ مستقل جاری رہتا
پنڈی یاد دوسرے شہروں سے لوٹتے تو فردا" فردا" ہر دوست کے گھر جاتے باہر
سے آوازیں دے کر ان کو بلاتے بغل گیر ہوتے شعرو سخن کی محفلیں سجتیں

سائیں دوست بھی رکھتے تھے اور حریف بھی جن سے معاصرانہ چشمکوں
کا مسلسل سلسلہ جاری رہتا تھا خاص طور پر استاد عبداللہ نے سے ان کے لگ
لگا خوب ہم چلتی تھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر غراتے تھے دونوں کے
شاگرد ایک دوسرے پر آنکھیں نکالتے تھے مگر ان چشمکوں میں بھی شائستگی کا
دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا استاد سائیں فی البدیہہ شعر کہنے میں ید

طولیٰ رکھتے تھے۔ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اس لئے اپنا کلام دوسروں سے
لکھواتے موقع محل کی مناسبت سے شعر اڈ اڈ کر ان کی زبان کا طواف کرتے
اور پھر ان کی یاداشت میں محفوظ ہوتے یا احباب کے کاغذوں میں مقیم ہو جاتے
گانے والے اور اہل نشاط ان سے کلام لینے کے لئے بڑی منتیں سماجتیں
کرتے۔ سائیں موج میں آتے تو نی البدیہی لکھوا دیتے ایک مرتبہ غلام حسین
ان کی حریف عبداللہ کے پاس گئے اور موسیقی کے کسی پروگرام کے لئے کلام
لکھوایا واپسی پر راستے میں سائیں سے ملاقات ہو گی غلام حسن نے کلام سائیں
کو سنایا سائیں سن کو چل پڑے چند ہی قدم گئے ہوں گے واپس لوٹے اور فی
البدیہیہ حرفی غلام حسین کو سنا دی اور کہا کہ اسے لکھو اور یاد کر کے گاؤ۔ یہ
روایت پروفیسر امداد حسین بیگ نے بیان کی ہے انہی کا یہ کہنا ہے کہ ایک مرتبہ
کسی دوست کے جنازے میں شرکت کے لئے سائیں قبرستان میں جا رہے تھے
وہاں بہت زیادہ دھول تھی لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے استاد سائیں نے یہ
منظر دیکھا تو پروفیسر امداد کو روک کر کہا کہ یہ کاغذ قلم ہے تو شعر لکھو۔ چنانچہ دنیا
کی بے ثباتی اور انسان کی خاک نشینی پر چند شعر فی البدیہ لکھوائے۔ پروفیسر
امدادحسین بیگ کو سائیں کا قرب ایک مدت تک حاصل رہا ہے سائیں کا
جب انتقال ہوا تو پروفیسر صاحب کی عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ سائیں
چونکہ ان کے محلے میں رہتے تھے اور پروفیسر صاحب شعر و سخن کے دل دادہ
تھے۔ اس لئے سائیں سے ربط ضبط قائم ہوا پروفیسر صاحب کی یاداشت بھی

اتنی تیز ہے کہ ستر سال پرانی باتیں بھی ان کو کل کی طرح یاد ہیں۔ یہ صلاحیت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ ان کی نظر بھی اسی سال کی عمر میں پوری طرح کام کر رہی ہے اور وہ بغیر عینک کے اپنا لکھا ہوا اچھی طرح پڑ لیتے ہیں۔ حافظے اور عمر کے لحاظ سے اس وقت وہ سائیں پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ سائیں اپنا کلام چھپوانے کے سخت خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ ان کا کلام ٹکے ٹکے بکے گا۔ چنانچہ مرتے دم تک اشاعت کلام کی مخالفت کرتے رہے جب ان کے کلام کا کچھ حصہ گجرات میں چھپا تو سائیں سیخ پا ہوئے اور اس کتاب کی اشاعت اور تقسیم کے کام کو روک دیا۔ پھر بہت بعد میں جناب رضا ہمدانی صاحب نے سائیں کے کلام کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کروایا۔ گجرات میں ان کی ۱۷۴ حرفیاں چھپی تھیں کتاب کے ناشر کو سائیں سے والہانہ محبت تھی اس نے کتاب کے نسخے مفت تقسیم کروائے تھے۔ رضا صاحب کی مجموعے میں ان کا خاصہ کلام ہے۔ پنڈی میں افضل پرویز نے بھی سائیں کے کلام کو اپنے طور پر چھپایا ہے ابھی سائیں کا بہت سارا کلام بزرگوں کے سینے میں ہے۔ کچھ ادھر ادھر بکھرا ہو گا اس موضوع پر تحقیق کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر اختر جعفری نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سائیں پر ایم فل کروانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تاکہ علمی تحقیق کرنے والے کھوج لگا کر ان کے کلام کو معدون کر سکیں۔

سائیں نے ہر قسم اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل نظم حرفی نعت منقبت ہر میدان میں گھوڑے دوڑائے۔ ان کی نعتوں اور منقبتوں میں

عقیدت و محبت کا جو گداز ہے وہ دلوں کو موم کر دیتا ہے۔ پیغمر اسلام اور اہل ہیت کرام کی محبت سے ان کا دل سرشار تھا ان کے نعتیہ اشعار میں ایک عابد شب زندہ دار سجدہ زیر نظر آتا ہے ان کا اصل میدان حرفی ہے حرفی گوئی کے وہ بلا شبہ بادشاہ تھے ان چار پائیوں کے تخت پر بقول مختیار علی نیر ہندکو کا تاجداری ہی بیٹھ سکتا ہے۔ حرفی گوئی ایک مشکل فن ہے اس لئے کہ اس مختصر شعری پیمانے میں مکمل بات کہنی پڑتی ہے جو ابتداء وسط انتہاء دعوی دلیل نتیجہ تاثر نظریہ کی لوازمات کے ساتھ تکمیل کے چوکھٹے میں فٹ ہوتی ہے سائیں کا کمال فن یہ تھا کہ وہ اس چوکور میدان میں علم فضیلت گاڑ گئے۔ ادب کے اس چوک میں ان کا کلام منارہ روشنی بن کر جھلمل کر رہا ہے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر جعفری اس شعبے میں وہ بے بدل ہیں۔ رباعی میں جو نام خیال 'بابا طاہر عریاں ابو سعید امجد حیدر آبادی جوش ملیح آبادی اور ضیاء جعفری نے پایا اور کمایا سائیں احمد علی نے حرفی میں وہ مقام پایا۔ مختیار علی نیر کی یہ بات درست ہے کہ سائیں ہندکو حرفی کا خیام ہے سائیں نے فرسودہ اور زنگ آلودہ الفاظ و تراکیب اور انداز و اسالیب کی جگالی نہیں کی بلکہ زور تخیل اور جولانی فکر سے نئی راہیں تراشیں۔ جس سے ہندکو زبان وادب کو لامحدود وسعتیں نصب ہوئیں۔

وہ فارسی عربی اور اردو کے الفاظ کو نئے نئے انداز میں ہندکو شاعری میں استعمال کرتے جس سے ایک تو ان کے اشعار کی علمی شان بڑھتی اور دوسرے ہندکو کا دامن وسیع تر ہوتا وہ زندگی کے شاعر تھے انہوں نے زندگی کو کتابوں میں

نہین پڑھا تھا بلکہ اس کے اندر رہ کر اس کے حقیقی رنگ و روپ کو مستعار خیالات کے ملمع کے بغیر جانچا پرکھا تھا۔ وہ تجربات و مشاہدات کا شاعر تھا جس کی شاعری میں زندگی نے خود اپنا خراج نچوڑ کر ڈال دیا تھا۔ سائیں نے اس قرض کو شعروں کے سانچوں میں ڈال کر زمانے اور زمین کو لوٹا دیا تھا۔ اس نے اپنے پاس کچھ نہیں رکھا جو لیا دہ ادا کر دیا سود کے ساتھ۔ ہندکو ادب پر ان کے لاتعداد احسانات ہیں۔ بقول پروفیسر خاطر غزنوی وہ ہندکو کے سخن ور شہسوار ہی نہ تھے ہندکو ادب کے ایک بہت بڑے مجدد بھی تھے۔ جن کے کلام میں قدم قدم پر جدتیں مچلتی نظر آتی ہیں۔ زنجیری دار شعر پہلی مرتبہ سائیں نے ہی کہے جس سے ہندکو کا قد بڑھ گیا ان کے اشعار میں عربی فارسی تراکیب کی کثرت نے ہندکو کی علمی شان کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ گلستان ہند کا سدا بہار گلاب تھا وہ بکاؤلی کہ وہ پھول تھا جس کی مہک سے آنکھوں کی روشنی اور بصیرت ملتی ہے ان کے کلام میں ہندکو اپنے شعور کی پختگی کا اعلان کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری قرار کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کا میٹھا پانی پی کر نیند بھی آتی ہے خمار بھی چڑھتا ہے طمانیت بھی بغل گیر ہوتی ہے اور اخلاص گلو گیر ہوتا ہے س ائیں کا دل غموں کی برچھیاں کھا کر بھی زندہ رہا وہ سدا بہار سب رنگ، ست رنگ، سخن ور تھا جو کبھی رند تھا تو کبھی صوفی جو کبھی پشاوری تھا تو کبھی پنڈی وال کبھی عشق مجازی کے گلستانوں کی گل گشت کرتا تھا تو کبھی بوستان معرفت کے افلاک میں گرداں تھا جو بقول رضا ہمدانی کبھی دھمال میں مصروف ہے کہ

کبھی بھنگڑا اور لڈی میں رقصاں ہے۔

وہ اپنی ذات کے دکھوں کو خوش طبعی کے رویوں میں لپیٹ کر تلخ لمحوں کو خوشگوار بناتا رہا اندر سے روتا مگر باہر سے ہنستا رہا۔ وہ خود دکھ اٹھا لیتا اور دوسرے کے دکھ بانٹ لیتا مگر دکھ دینے کو وہ گناہ کبیرہ گردانتا تھا۔ کسی کا دل نہیں دکھایا۔ بس یہی اس کی عبادت تھی۔ تتلیوں کی طرح رنگین اور پھولوں کی طرح معطر حرفیاں کہنے والا یہ سنگین شاعر بقول رضا صاحب قطب صاحب کی لاٹ کی طرح بلند بالا مضبوط مستحکم تھا۔ جس کا فکر و خیال رفعتوں کا ہم نشین تھا جس کی باتیں دل نشین پہلو دار اور گہری سوچ کی آئینہ دار ہوتی تھیں و نکتہ سنج بھی تھا اور بزلہ سنج بھی جو اپنے شعروں کے ذریعے ہنسا بھی سکتا تھا اور رلا بھی سکتا تھا جو منفرد اور مختلف انداز کا مالک تھا۔ جس کی آواز ہزاروں لوگوں میں اپنی شیرینی اور شگفتگی کے باعث پہچانی جا سکتی ہے۔ جس نے ناخواندگی کے پتھروں کو پگھلا کر تجربے و مشاہدے کو بھٹی میں کندن بنایا اور پھر اس کندن سے ہندکو کی دلہن کے ماتھے کا جھومر بنایا انشں کی طرح مرصع کار اس شاعر کو ناقدوں نے غالب عصر قرار دیا۔ مولا بخش امرتسری بھی اسے پنجابی کا غالب کہتا ہے۔

ہندکو کے نقاد ان فن ان کو ہندکو کا غالب اور طوطی ہندکو کے لقب سے یاد کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے اس ہم عصر کو غالب کا ہم پلہ کیوں قرار دیا جاتا ہے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ غالب کی طرح سائیں بھی تلمیذ الرحمان تھا۔ رسمی تعلیم سے معرا و مبرا۔ غالب ہی کی طرح انکے کلام میں

فارسی عربی تراکیب کی بھرمار ہے۔ غالب ہی کی طرح ان کے کلام میں اچھوتے استعاروں نادر تشبیہوں اور عمیق کنایوں کا بازار سجا نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں غالب کی طرح گہری سوچ اور فکر کے ایک روکار فرمانظر آتی ہے جو فلسفیانہ بصیرت سے ہم کنار ہو کر رفعتوں کی رفاقت اختیار کرلیتی ہے۔ بلند آہنگی اور عالی دماغی ان کی شخصیت کے بھی کلیدی اجزاء ہیں۔ غالب خود پسند تھا سائیں بھی اپنی ذات سے محبت کرنے والے خود نگر آدمی تھا جو بقول شخصے ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا یہ خود پسندی اور انا پرستی بھی ان کو غالب کے قریب لے جاتی ہے اسی طرح زندگی کے دکھوں اور غموں سے مردانہ وار مکھی جنگ لڑنے کا حوصلہ بھی غالب و سائیں میں مشترک ہے۔ دونوں زندگی کی رگوں سے رس نچوڑنے کے قائل ہیں۔ دونوں زندگی کے شاعر ہیں دونوں کتاب سے زیادہ حیات و کائنات کو مرکز نگاہ بنانے کا سلیقہ رکھتی تھے۔ دونوں کا انداز معذرت خواہانہ کی جگہ جارحانہ ہے۔ دونوں کو فطرت کی طرف سے مزاح و ظرافت کی حس فراوانی کے ساتھ ملی۔ اور دونوں اس کا بھرپور استعمال بھی کرنا جانتے تھے۔ دونوں کا انداز بیان انوکھا' نرالا اور چونکا والا ہے۔ دونوں کی بات دل سے نکلتے ہی دل تک پہنچتی ہے جس میں فکر و خیال کی پختگی شامل ہو کر ذہنی لذت آفرینی کا سامان مہیا کرتی ہے دونوں کے لئے شاعری لفظوں کا کھیل نہیں جذبات و احساسات کی فکری شجرکاری ہے۔ دونوں اسلوب کی معجز سامانی سے شعروں میں نشتر کی کاٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ فکری دونوں مغلوب نہیں غالب ہوئے

ہیں۔ اردو کا غالب غالب سے مناسبتیں رکھنے والا پشاور کا البیلا شاعر احمد علی سائیں ہندکو زبان کی آبرو اور امانت ہے جس کے وقار کے سبب ہندکو کا نکھار قائم رہے گا۔

فیض احمد فیض

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالۂ و ارغواں کیسے کیسے

ہم گل ولالۂ و ارغوان تو نہیں۔ مگر فیض کے شہیدوں میں ضرور داخل ہیں۔ ہمارا یہ عاشق ہمارے لئے من اور تن کی بازی لگاتا رہا۔ ہمارے ہی لبوں کی مہروں کو توڑنے کیلئے ہر حلقہ زنجیر میں زبان رکھے منتظر فردا تھا

سو پیکاں تھے پیوست گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

وہ ہمارا ہی تھا۔ ہمارے لئے ہی صلیب و دار پہ سجنے کا اہتمام کرتا رہا۔ ہم نے ساتھ نہ دیا۔ ہم نے ہی گواھیاں دیں اس کے خلاف۔ ہم ہی سلطان ہم ہی سلطانی۔ پر وہ ہماری ہی راہ تکتا اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرگیا۔ اب چراغ زیبا لے کر خاک و آب و باد سے پوچھتے پھریں گے۔ کہ تو نے وہ گنج گرانمایہ کہاں چھپایا۔ ڈھونڈ کے لا اے نگار وطن اپنے اس والا و شہید کو۔ خس و خاشاک' جھاڑیاں کانٹے' بے ثمر اشجار بید تو نوحہ کناں ہیں ہی۔ کہ وہ ان کا الاؤ بنا کر حیات کی راہوں میں خورشید کاشت کرنے کا تمنائی تھا۔

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی

لا کے رکھو سر محفل کوئی خورشید اب کے

مگر دوسروں کی زندگی گزارنے والے گل ولالۂ و ارغوان جو ہفت سالہ فصل بہار میں تیز دھار کانٹوں سے جبین فیض چھلنی کرتے رہے۔ اچانک فیض کے شہیدوں میں داخل ہو کر بیعت دست سبو کرتے نظر آرہے ہیں۔ خواب تھا یا خیال تھا۔ ماہ تھا یا سال تھا کیا تھا کیا ہے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ نو شہیدان فیض، فیض کے ماتم میں ہلکان ہو رہے ہیں ۔ وہ حیات فیض کی دوسری کروٹ کو دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں۔ فیض فیض کر کے آپ فیض ہونے کا بن پئے ہنگامہ برپا ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے ان زود پشیماں پشیماں ہونا

فیض نگاریوں اور فیض آرائیوں کے جشن کا سماں ہے۔ ہر ہاتھ ملانے والا دوست دار فیض بن فیض کاریوں میں مصروف ہے۔ یوں لگتا ہے کہ 20 نومبر کو ایک نیا فیض پیدا ہوا ہے۔ جو مرنے کے بعد سوا لاکھ کا ہو گیا ہے۔ فیض پسندوں کو نیا فیض مبارک ہو۔ فیض کے اصلی اور وڈے شہید تو وہ لوگ ہیں جو ساری زندگی جھڑکیاں گھرکیاں، تھپڑ ٹھڈے کھاتے رہے۔ آنسو پیتے اور غم کھاتے رہے۔ دکھ اٹھاتے رہے۔ جن کے سروں پہ چادر ہے نہ پاؤں میں جوتا۔ جن کے پیٹ میں چوہے، ہونٹوں پہ پپڑیاں ہیں۔ جو راتوں کو ستارے اور دن کو پسلیاں شمار کرتے ہیں۔ جو دن کو پتھر کوٹ کر رات کو پیٹ پر باندھتے ہیں۔ اور اہل حرص و دل کی عقل پر پتھر ڈال کر غم کی چھاوں میں سو رہتے ہیں۔ فیض ان کا کیا لگتا ہے میرا کیا لگتا ہے کسی کیا لگتا ہے۔ وہ سب کا لگتا ہے سب کا ہوتا

سونا ہے۔ فیض کو دوسروں سے محبت نے اس معجزے سے دوچار کیا کہ سنگ کسی پہ گرتا اور زخم ان کو آتا۔ دوسروں کے زخم اپنے تن بدن پہ مہکانے کا معجزہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب اندر محبت کی کٹاریوں کا کھیت اگتا ہے

یہ معجزہ بھی محبت دکھائے مجھے
کہ سنگ اس پہ گرے اور زخم آئے مجھے

فیض کے اپنے زخم اور دکھ تو کم ہی تھے۔ جیل' جلاوطنی اور جہالت نے قدم قدم پہ جو ان کا ساتھ دیا تو یہ کوئی عجیب اور انہونی بات نہیں۔ سر سرداروں کے ہی کٹتے ہیں۔ فیض زخم کھاتے اور پھر سلواتے رہے۔ تاکہ زخم سازوں کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔ ساری دنیا کے لوگ فیض کے زخمیوں کو دیکھ کر ہی زخم کاروں کی قوت و بازو کی پیمائش کیا کرتے تھے۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں لٹانے والا ٹک روتے روتے سوگیا ہے۔ اٹھئے کہ لذت خواب سحر گئی

فیض کم گو' نفاست پسند اور عالی حوصلہ انسان تھے۔ لفظوں کے جوہری' فکری کمال اور لسانی جمال کے تاجدار' غزل کے بے تاج بادشاہ' فکر میں روایت شکن' لفظوں میں روایت پسند' لفظوں سے ایسی وضعداری اور یاری نبھائی کہ ان کی قدر' مقدور اور نصیبہ بدل گیا۔ غالب کا عمق' اقبال کی وسعتوں سے ہوتا ہوا فیض کے کاروبار گلشن میں داخل ہوا تو تخلیقی جدتوں سے ہم کنار ہوکر تازہ بستیاں آباد کرنے لگا۔ یہ لڑی اور کڑی ختم ہوگئی۔

اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ فرہاد صفت فیض کے ہر مصرعے اور لفظ کے پیچھے ایک شیریں چھپی بیٹھی ہے۔ جو نطق و کلام میں شیرینیاں بانٹی' پھول برساتی فکر کے افق پہ نمودار ہوتی ہے تو سخن کی بدلیوں سے لالہ فام رم جھم برسات

بپا کرتی ہے۔ فیض اپنے فلسفہ و فکر پہ مدام قائم و مدائم رہے۔ کوئی قہر کوئی مہران کو اس راہ سے نہ ہٹا سکا۔ مختصر بات، کام کی بات، ایک ہی بات، وہ سنار تھا مگر لوہار کا ہتھوڑا بھی پاس رکھتا تھا۔ ہیر پھیر، منافقت و ریا سے کبھی کسی طرح کا تعلق و واسطہ نہ رکھا۔ جو کہا ڈنکے کی چوٹ پہ کہا۔ مگر خوشبوؤں، رنگوں، نغموں کے لیکوں میں لپیٹ کر کہا۔ فلسفے کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنا دیا

من نہ آنم کہ دو صد مصرعہ رنگین گویم
مثل فرہاد گویم و شیریں گویم

وہ رکے تھے تو کوہ گراں تھے۔ چلے تو جان سے گزر گئے۔ رہ یار کے قدم قدم کو یادگار بنا گئے۔ اپنے قتل نامے کے سر محضر لگی مہروں کو دیکھ گئے۔ جان ہاری پر بازی نہیں ہارے۔ فیض تو چلے گئے۔ ان کے نام پر اپنا کاروبار چلانے والے اب کیا کریں گے۔ اب ناوک اندازوں کا کیا بنے گا۔ کس پہ پتھر برسائیں گے۔ کس کا گھر ڈھونڈیں گے۔ شب ہجر کو اب کون پناہ دے گا

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

وہ اپنے چارہ گروں کو نوید دے گئے۔ صف دشمناں کو خبر کر گئے۔ قرض حیات ادا کر گئے۔

میرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض نرم گرم، سجیلے شرمیلے، معصوم مغموم سے صاف گو انسان تھے۔ جن کی شخصیت کی کلید انکسار کے سوا کچھ نہیں۔ پر عزم و وقار حلم کی ایک دبیز تہہ

تھی کہ ان کے ذہن و قلب پہ خیمہ زن تھی۔ شرافت تھی کہ شائستگی کے شعار کا ہالہ بنائے ان کے کردار کا طواف کررہی تھی۔ ایک انداز دلبری ایک شان دلربائی تھی کہ نفس و نطق کی ہمزاد بنی رہی ۔ اندر سے گرم اس انسان نے گرمی کھائی نہ گرم ہوا۔ کسی چنار آلود پہاڑوں میں خزاں کی شعلہ بداماں اداسی کی مانند ان کے شعروں کی صداقتیں سناٹوں میں صدائیں گھولتی رہیں۔ وہ مومیائی کا سوداگر اندر باہر سے موم کی طرح نرم پگھلتی ہوئی حدتوں کے دیپ لہجے کی جبیں پہ سجائے راہ حیات میں بڑھتا رہا۔ غم جہاں ہو کہ غم یار یا تیر ستم وہ سب کے سامنے سینہ سپر' فراخ بانہوں کے ہار لئے موجود تھے

غم جہاں ہو غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

فیض کی زندگی' فن' اخلاق کردار سبھی کچھ ایک شائستہ وضعداری اور شستہ دلداری سے عبارت ہے۔ وہ گرے نہ جھکے بکے نہ رکے' دل پہ چلنے والی آریوں کی داستان رقم کرتے رہے۔دوستوں دشمنوں سبھی سے عاشقی کو نبھایا

غم جہاں ہو رخ یار ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

وہ جس سے بولے نال سلوک دے بولے۔ وہ تھے ایسے ہی جن کا کام سلوک سے بولنا ہی تھا۔ ان کی زندگی سلوک سے عبارت تھی۔ ان کی زندگی میں تضاد تھا نہ ان کے فکروفن میں شتر گربگی۔ اس عیب سے میر جیسا شاعر نہ بچ سکا۔ درد' غالب' اقبال کے بعد فیض کو ہی یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ان کا کلام بلندی پستی کی آنکھ مچولی سے آزاد ہے۔ اس میں اٹھان ہی اٹھان ہے۔ بلندی

ہی بلندی ہے

کچھ بزر جمہروں کا یہ خیال ہے کہ فیض کو زمین اور زمانے نے ان کے حصے کی حیثیت و وقعت سے ہم کنار کردیا تھا۔ اگر ریاستی سطح پر ان کی پذیرائی نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں ریاست و حکومت کچھ چیز ہی نہیں۔ حالانکہ اس بدقسمت دنیا میں صرف ریاست و حکومت ہی اصل حقیقت ہوتی ہیں۔ انسان تو یہاں جھونگے اور جہیز میں ملے ہوتے ہیں۔ چرچل کا کہنا ہے کہ دنیا میں دو طرح کی ریاستیں ہوتی ہی•۔ ایک وہ جو عوام کی ملکیت ہوتی ہیں اور دوسری وہ جن کی ملکیت عوام ہوتی ہیں۔ اس تیسری دنیا میں جسے ریاستی آشیرباد حاصل نہیں۔ وہ تو جیتے جی مرجاتا ہے۔ یہ فیض کی سخت جانی تھی کہ وہ زندہ رہے۔ تیسری دنیا کی بدنصیبوں سے بے خبر دانشور فیض کے جیل' جلاوطنی' زندگی بھر کی سنگ زنی' کو صرف شتر غمزہ ہی سمجھتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ فیض کی یہ زندگی کس قدر کانٹوں میں گزری ہے۔ یہ تو ان کے ظرف کا کمال تھا کہ وہ چیخے نہیں تڑخے نہیں۔ ورنہ فیض کو تو ہم سن اکاون ہی میں کھا کے ہضم کرچکے ہوتے۔ زندان نصیب شاعر کو ان بیڑیوں سے ہم مضمون بازوں کی پس مرگ فیض نوازیوں یا سکرین آمیز محبتوں نے نہیں نکالا۔ بلکہ ان کو جو محبت ہمارے ساتھ تھی یہ اس کا طفیل ہے کہ وہ مرمر کرجی اٹھے۔ ورنہ ہماری ساری نام نہاد نیت کی زیر لب محبتیں تو سرد چراغاں فیض کی ایک چیں جبیں کو ہموار نہ کرسکیں۔ جو ہم سب کے پیارے تھے۔ جو ہم سب کی آنکھوں کے تارے تھے۔ وہ فیض اب اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ زندگی بھر طوفان سے لڑتے بھڑتے' حوادث سے سر ٹکراتے' طعنوں منہوں کے پتھر سہتے سہتے کوئے یار سے

نکلے تو سوئے دار چلے۔ یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا۔ انگلیوں میں سگرٹ اور ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے محبت کے گھاٹ اتر گئے۔ ان کی زندگی ہنگاموں سے پر تھی۔ مگر وہ جینے کے ہاتھوں مرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ موت کی کوکھ سے زندگی نمودار کرنے لئے کوشاں رہے۔ وہ خواجہ میر درد کی طرح جینے کے ہاتھوں زندگی کا سہاگ لٹانے پر رضامند ہرگز نہ ہوئے۔ البتہ وہ جس لئے آئے تھے وہ ضرور کر چلے۔

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لئے آئے کیا کر چلے

اتنی تہمتیں، اتنے الزامات، اتنی گالیاں جمع کرلی تھیں۔ کہ ان کو واقعی کیش کرواتے۔ تو کہیں یونائیٹڈ سٹیٹس میں بہت بڑے، ریچنوں کے مالک ہوتے۔ یہ نہ ہوتا تو پنجاب کے کسی چک میں مربعوں کا کارخانہ ہی کھول لیا ہوتا۔ مگر انہوں نے یہ سب کچھ نہ کیا اور گالیاں جمع کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ جن کی مقدار ان کے سارے کلام سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ اب سمجھ نہیں آرہی کہ اس متاع حیات خرمن بہار کو وہ کتنے ٹرکوں میں بھر کر ساتھ لے گئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ فیض صاحب بڑے ٹھنڈے میٹھے آدمی تھے۔ غصہ ان کو بالکل ہی نہیں آتا تھا۔ پتہ ان کو لگایا نہیں گیا تھا یا انہوں نے بعد میں دوستوں کا دل رکھنے کے لئے مار لیا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ کسی نے فیض کو غیض میں نہیں دیکھا۔ تین ہی چیزیں پینے کا ان کو از حد شوق تھا۔ غصہ، سگرٹ اور شراب۔ تیسری چیز سے تو انہوں نے جہاں تہاں جان چھڑالی تھی۔ مگر سگرٹ نے ان کی جان نہ چھوڑی۔ چنانچہ آپ غصے اور سگرٹ کو ملا کر پیتے رہے۔ یاروں نے کیسے کیسے

تیر ان پر نہیں چھوڑے۔ کس کس گالی سے ان کو نہیں نوازا۔ مگر یہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ڈھیٹ کا ڈھیٹ نہ گالی' نہ غصہ' نہ اشتعال۔ بس وہی چال بے ڈھنگی۔ جو تھی وہ رہی۔ وہی محبت و مروت میں لپٹی' انکسار و اختصار میں رنگی بے غرض و بے لوث مسکراہٹ ہر انسانی چہرے پہ چھڑک رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا بھی کہ اے شریف آدمی کبھی کبھی جھوٹ موٹ کا غصہ طاری کرلیا کرو' ایک آدھ بڑھک ہی مار لیا کر' اور انہیں تو چہرے پہ تصنع کا قبض ہی چڑھالیا کر' کم از کم دبتوں کو تو دبالیا کر۔ مگر یہ نرا ہی سادہ آدمی تھا کسی عقل کی بات کو بھلا سمجھتا تھا۔ اپنے کٹر ترین دشمن سے بھی ایسے ملنا جسے وہ ان کا سگا ہو۔ ان باتوں پہ ان کے دوستوں کو غصہ آجاتا تھا۔ پیچ و تاب کھاتے تھے۔ منہ پھیلاتے تھے مگر فیض صاحب زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ ہر مرض کی دوا ان کے پاس مسکراہٹ کی صورت میں ہمہ وقت موجود تھی۔ فیض صاحب حسد جلاپے اور رشک سے بھی پاک رہے۔ وہ اپنی نبیڑھنے کے قائل تھے۔ دوسرے جو کچھ کررہے ہیں اس سے ان کو کبھی سروکار نہ رہا۔ ان کے پاس ان چھوٹی باتوں اور حرکتوں کے لئے وقت نہ تھا۔ وہ ایک آئیڈیل کی تلاش میں تھے۔ اس کے لئے وہ توڑ پھوڑ کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ اپنی فوجوں کی تعداد بڑھانے اور مضامین نو کے انبار لگانے سے دشمن کے دانت کھٹے کرنے کے قائل تھے۔ ان کا کہنا اور کرنا یہ تھا کہ اتنا سچ لکھو اتنے تواتر سے لکھو' اتنے مٹھاس سے ملو' اتنی محبت کو عام کرو کہ جھوٹ اور فریب کے کاشتکار خود اپنی کھیتیاں چھوڑ کر فرار ہوجائیں۔ وہ فتوحات محبت میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا سارا فلسفہ و فکر اسی نکتے کی تفسیر ہے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض صاحب دھیمے دھیمے' ہولے ہولے' پولے پولے سے انسان تھے۔ جن کا لہجہ' جن کی گفتگو' جن کا انداز تکلم شائستگی کی منہ بولتی تصویر تھا۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کے ہاں عربی فارسی نے انگریزی میں مل کر اردو کے چہرے پہ غازہ ملاتھا۔ ان کے اشعار میں شاعرانہ دیوانگی' دانشورانہ فرزانگی کی عبا اوڑھ کر عیاں ہوئی۔ وہ بات کرتے تو یوں لگتا جیسے منہ میں رس ملائی گھلی ہو۔ مخاطب حریف ہی کیوں نہ ہو روبرو ہونے پر سپراندازی پہ مجبور ہوجاتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے نشر ہونے والے محبت و مروت' اخلاص و وفا کے تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتے اور مخاطب گھائل ہونے میں ہی عافیت سمجھتا۔ دوسروں کو گالیاں دینا تو ان کو آتا ہی نہیں تھا۔ خود بھی گالیاں کھاکے بے مزہ ہونا انہوں نے ایک مدت چھوڑ رکھا تھا۔

بعض حکمائے جدید کا یہ کہنا ہے کہ انقلاب نفرتوں کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اور انقلاب کی باتیں کرنے والے نفرتوں کے اسلحے سے لیس ہوتے ہیں۔ اور ان کی باتوں سے بغض و عناد فساد ضد اور تخریب کاری کی بو آتی ہے۔ یا آنی چاہئے۔ مگر فیض صاحب انقلابی سوچ رکھنے کے باوصف اپنی تحریروں تقریروں میں خوشبوؤں کی مہکار اور شہد کی حلاوت لئے ہوئے تھے۔ انقلاب کی چوٹ اور چبھن بڑے بڑوں کو جراحت پہ آمادہ کردیتی ہے۔ اس ترنگ میں اقبال جیسا شاعر بھی جارحیت کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا ہے

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو

کاخ امرا کے در و دیوار ہلادو
جس کھیت سے دھقان کو روزی نہ ہو میسر
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

مگر فیض ایسے مرحلے پر بھی دامن توازن کو تھامے نظر آتے ہیں۔ ماحول کی شکست کے لئے اپنے پرزے اڑانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

دیدہ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
شیشہ چشم میں خوناب جگر لے کے چلو
اب اگر جاو پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسہ سر لے کے چلو

فیض صاحب اپنی جان کی قربانی دینے کو انقلاب کی خشت اول قرار دیتے ہیں۔ وہ بھبو کا بنیے ' بھڑک اٹھنے یا بڑھک مارنے والے بھبکے باز نہ تھے۔ وہ انقلابی ہونے سے قبل سچے اور سچے فنکار بھی تھے۔ جن کی کلامیں جذبوں کی طغیانی شبنمی ریزوں میں ڈھل گئی۔ اور تند و تیز فکر کے جھونکے باد نسیم کے ہلکوروں کا پتہ دے رہے ہیں۔ گہری سوچ موھنے لفظوں میں گندھ کر شاداب تنظیم کی آب و تاب دے رہی ہے۔ وہ درد کی مانند جی میں والی چیز کو اپنے اندر مار کر کشتہ بناتے ہیں۔ اور اسے لاچار انسانوں کے زخموں پر مرھم بناکر باندھتے ہیں۔ وہ میر کی طرح درد و غم کی کرچیوں کو جمع کرکے اپنا دیوان مرتب کرتے رہے۔ غالب کی طرح فریادی نقوش انسانی کو کاغذی پیرھن پہناکر ذوق قدح سے بزم چراغاں کرنے کا ساماں کرتے رہے۔ وہ اقبال کی طرح شاعری کو دیدہ بینائے قوم کا سرمہ بناکر ذروں کے قلب سے خورشید کا خون

ٹپکانے کے خواب دیکھتے رہے۔ وہ ناصر کاظمی کے بقول دھیان کے صد راہوں پر بال کھولے روتی آدمیت کے زخمیوں کی چاپ کو گونج میں تبدیل کرنے میں مصروف رہے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے زخم کرتے رھیں گے

چلنا بڑھنا حرکت کرنا زندگی کا مقصد اولین تھا۔ وہ پیچھے دیکھنے والے آدمی نہ تھے۔ ان کی نگاہیں آگے' دور' افق مستقبل پر ہوتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں زخمی' جسم دریدہ' قلم رستاہوا' انگلیاں فگار' قدموں میں تھکاوٹ' مگر بازیچہ روزگار میں پیہم رواں دواں' فکروخیال کے ساغرو مینا سامنے دھرے ہوئے۔ آنکھوں میں دم تھا۔ حوصلہ جواں تھا۔ سوچ رعنا تھا۔ ہارے نہ ہار مانی مقابلہ کیا۔ ناکامیوں سے کام لیا دل پر خون کی گلابی سے عمر بھر شرابی رہے۔ چلتے رہے۔ آگے آگے ہر حال میں ہر خیال میں

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

ان کو رستے کو کوئی مقام بھاتا بھی نہ تھا۔ وہ کوئے یار سے نکل کر سیدھے سوئے دار جانے کو ہی حاصل حیات جانتے تھے

عشق میں کیسی منزل مقصود۔
وہ بھی ایک خار ہے جو راہ میں ہے

زندگی تو ایک غیر مختتم سفر کا نام ہے۔ یاں کے سپیدو سیاہ میں ہمارا دخل گو رات کو رو رو صبح کرنا اور دن کو جوں توں شام کرنا بھی ٹھہرتا ہے۔ مگر اس شب

غم کو دشمناں سحر کی آنکھ میں کھٹک کر اور پاؤں میں چبھ کر گزرنا بھی حوصلہ مندوں کا کام ہے۔ فیض ایسے ہی حوصلہ مند انسان تھے۔ وہ لیلائے وطن، شیرین انصاف اور سوھنی آزادی کے پرستار مہینوال تھے۔ جو اپنی جان اور جگر کا نذرانہ اپنی سسی کے قدموں میں نثار کر گئے۔ ان گلیوں پہ نثار ہو گئے۔ جہاں سر اٹھانے کی رسم نے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ قوم کا سر اٹھانے کے لئے جبر کی صلیب پر اپنا سر چڑھا دیا

صحرا میں پڑے پہرے اور قفل پڑے بن ہیں
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

انہوں نے اپنے دونوں جہان بے نام و چہرہ انسانوں کے اس سلگتے فاقہ زدجہاں پر وار دئے۔ ہار جیت کے خوف کے بغیر

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

فیض عشق و محبت کے پرستار تھے۔ مگر انہوں نے اپنے عشق کو حیات کے محروم انسانوں کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ان کے محبوب وطن اور اس کے غریب انسان تھے۔ وہ بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی دنیا میں حسن خوبان اور عشق خوباں کو ہی ایک حقیقت نہیں مانتے تھے ۔ وہ خیال طرہ لیلیٰ کو اپنی زندگی کا محور ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ محبت کے دکھوں کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے دکھ یہاں موجود ہیں۔ وصل کی راحتوں کے علاوہ بھی بڑی بڑی راحتیں موجود ہیں۔ ان کا یہ کہنا غالب افکار کا پر تو اور دور جدید کا شعری منشور ہے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی وصل کی راحت کے سوا

غالب نے سو سال پہلے غم عشق کے مقابل غم روزگار کو لا کھڑا کیا۔ اور وہ شعر کہا جو عہد نو کا نقیب بنا

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم یہ بہت سے ستم ہوئے ہیں

جب ہر طرف دکھ درد اور فریب کا راجہ ہولی کھیل رہا ہو۔ جہل و جعل کا بازار گرم ہو۔ اولاد آدم بھوک سے بلک رہی ہو۔ آزادی و انصاف کے خزانوں پہ کالے ناگ پھن لہرائے ناچ رہے ہوں۔ ناتوانی اور غربت جرم بن جائیں اور دولت و اقتدار قہر خداوندی بن کر افلاس کے گھروندوں میں تاخت کی ہولی کھیل رہے ہوں۔ ایسے میں ہوشمند شاعر اور باضمیر انسان کیونکر خیالی پیکروں کے چرنوں میں بیٹھ کر زلفوں کی درازی کی دعائیں مانگ سکتا ہے۔ اسے اصلی محبوبوں سے بھی رخصت لینی پڑتی ہے۔

نہ ہم بے وفا ہیں نہ تم بے وفا ہو
مگر کیا کریں اپنی راہیں جدا ہیں

یہ راہیں جدا کرنی پڑتی ہیں۔ یہی مقام ہے جب فیض پکار اٹھتا ہے

ع۔۔۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

کیونکہ زندگی زلف و رخسار کی جنت نہیں کچھ اور بھی ہے۔ انسانی شخصیت میں اس قدر گھاؤ پیدا ہوئے ہیں کہ تکمیل عشق سے طمانیت حاصل نہیں ہوتی۔ اپنی ذات کی درزوں میں پنبہ دہی کا منصب ادا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ جھکڑ آندھیاں لوئیں آشیانوں کے لئے تاراجیاں ہی لے کر آتی ہیں۔ ایسی بے

بضاعتی کے لمحوں میں فیض نے کہا تھا۔

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

فیض اس صبح کی تلاش میں تھا جو وطن میں ہریالی اگادے' پھول کھلا دے۔ آزادی انصاف صداقت کے چہرے چمکادے۔ افلاس بیماری اور جہالت کا رستہ کھوٹا ہو۔ ہر طرف خوشحالی ہو۔ ہر لحاظ سے وہ ایک بہت بڑے آئیڈیلسٹ تھے۔ جو انہونی کو ہونی بنانے کے لئے سرگرم عمل رہے۔ بوکھلائے جھنجلائے نہیں۔ دھیمے دھیمے انداز میں اس سویرے کی راہ تکتے رہے۔ جو کہیں بھی نہیں آیا۔ جو شاید کبھی نہ آئے۔ فیض بھی یہ جانتے تھے مگر وہ صبحوں کے انتظار میں شاموں شبوں کے اندھیروں میں ظلمتوں سے پنجہ آزما رہے۔ یہ ان کا عقیدہ' عبادت' حاصل سب کچھ تھا۔ اغیار اسی پہ سیخ پا ہوتے۔ مگر ان کے فن' فکر' اسلوب کے آگے بے بس ہو کر ہتھیار ڈالنے لگتے۔ تو پھر ان کے حب وطنی کو چیلنج کردیتے۔ فیض صاحب کی ساری زندگی اس قسم کے سرٹیفیکوں کے اجراو تنسیخ کے کاروبار میں گزری۔ اب ان کے بعد سندوں کے انبار لگ گئے ہیں۔ ان آنکھوں نے بھی مرے ہوئے پانی کے پیاز آلود ٹسوے بہانے شروع کردئے ہیں۔ جو عمر بھر ان پر غیض برساتی رہیں۔ یہ بھی ہونا تھا۔ ستم ظریفوں نے اشارہ شاہ پاکر فیض کو وال پیپر بناکر اندر کے دھوئیں' غبار اور گرد پر لیپ دینے کی سعی ہو رہی ہے۔ جیسے فیض نہ ہو۔ مرا ہوا شیر ہو جسے شکاری خود ہی مار کر اپنی ڈرائینگ روم کی دیواروں پہ سجانے کے بعد ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کھال کی خوبصورتی میں نغمہ سنج ہو۔

اس کو بے مہری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مرگئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

فیض کی زندگی جدوجہد سے عبارت تھی۔ مگر یہ جدوجہد منفی سوچوں پر مبنی کف در دہاں کھوکھلی جذبات جذباتیت کا اشتہار نہیں بلکہ اس میں تعمیر جہاں دگر کا اثباتی رنگ بہار دکھاتا ہے۔ فیض کی سوچ ٹھوس، جامع اور بالغ و بلیغ ہے۔ ان کی فکر، ان کے مطالعے، مشاہدے اور گہرے احساس کے بطن سے جنم لینے والے بین الاقوامی انسانی شعور کی لطافتوں کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی سوچ کو نفرت کے شعلوں میں بھسم نہیں کیا۔ اور نہ ہی اپنی فکری عمارت ضد، تعصب اور ریا کی بنیادوں پر اٹھائی۔ ان کی فکر انسانی محبت اور فرزند آدم کے درد مشترک کا مرثیہ، نوحہ، بین، ماتم، اور مرہم ہے۔ انقلابات کی آفرینش میں طرح طرح کے عوامل کام کرتے ہیں۔ جن میں دو یعنی محبت اور نفرت، بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر انقلابوں کی جڑوں میں نفرت کا زہر پھنکارتا محسوس ہوتا ہے۔ مگر فیض کی انقلابی فکر و نظر کے آگے پیچھے دائیں بائیں محبت و آتشی کی بوندیں ترنم ریز نظر آتی ہیں۔ ان کو انسانوں سے جو محبت تھی جو پیار تھا وہی انقلاب کا پیش خیمہ بنا۔ اس کی راہ سے ان کے دامن دل میں تغیر و انقلاب کی کلیاں چٹکیں۔ فیض صاحب نے غم حیات کو غم ذات بنادیا تھا۔ اور اس غم ذات کو غم کائنات بناکر پیش کرتے رہے۔ اور بے بس و لاچار انسانوں کو زندہ رہنے کا حوصلہ دینے کے لئے زندہ رہے۔ وہ تو ان لوگوں کے لئے روتے رہے۔ جن کو گردش حالات نے رونے کی فرصت دی نہ رونے کا سلیقہ سکھایا۔

رونے والوں سے کہو ان کا بھی رونا رولیں

جن کو گردش حالات نے رونے نہ دیا

فیض صاحب نے عمر بھر طبعی تو 73 برس پائی۔ مگر ان کی شب ہائے ہجر کو اگر حساب میں رکھیں تو پھر بتانا مشکل ہوگا کہ وہ کب سے اس جہاں خراب میں تھے۔ وہ جس حال میں تھے لڑتے اور ھنستے پائے گئے۔ دونوں جہان محبت میں ہار کر اور اپنے سارے اختیار لٹاکر حوصلوں کے چراغوں میں اپنی وفا کے آنسو جلاتے رہے۔ ستائش وصلے' شکایتوں' حکایتوں سے بے نیاز

نہ سوال وصل' نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
تیرے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

وہ اپنی عافیتوں کے خرمن کو آتش زیر پاکر کے نگاروطن کی ظلمتوں کو شمشانوں سے ہمکنار کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کے ہاں فکری تسلسل' ایک متصوفانہ استقامت(Consistency)ملتی ہے۔ جو تار شمع کی مانند وجو کے موم کے اندر سرایت کئے ہوئے تھی۔ اس دھاگے کے استقبالی سرے پر ایک دھڑکتی ہوئی لو غیر مختتم شعلہ نوائی میں مصروف پیکار رہی۔ دھیمی آنچ کی یہ تابکاری تاحیات لب آزما رہی۔ ایک اضطراب مسلسل تھا غیاب تھا۔ کہ حضور' سوزوتب وقاب از اول تا آخر' رگوں میں دوڑنے والا خوں تھا جو جوئے خوں بن کر شب فراق میں شمع فروزاں کی صورت حرف و صوت کے زخم کھلاتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو توڑ کر شعروں میں ڈھالتے رہے بقول غالب:۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی ہی شکست کی آواز

وہ دھان زخم اس لئے پیدا کرتے رہے تاکہ یار سے راہ سخن واہو سکے۔ وہ اپنی

دیوار زنداں کے روزنوں میں اندھیروں کے استقبال کے بدلے اپنے وطن کی مانگ میں ستاروں کے زعفران کے طلبگار تھے

مقتل میں کچھ تو رنگ جمے رقص کا
رنگین لہو سے پنجہ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامن جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

فیض صاحب کے ہاں یہی فکری تسلسل اور فلسفیانہ استقلال شاعرانہ جمال کی بو قلموں نیرنگیوں کے ساتھ بے محابا جلوہ فگن ہے۔ انہوں نے کسی مرحلے پر غریب کو چھوڑا اور نہ غریب نے کسی مرحلے پر ان کو چھوڑا۔ چھوڑا ہے تو اسے درمیان والے لوگوں نے، اور بقول میر یہ درمیان کے لوگ ہی فتنہ بردار ہوا کرتے ہیں۔ فیض کے مرنے پر چیتھڑوں میں لپٹے بدن اور غربت میں نہائے ہوئے زخم پکار پکار اٹھتے ہیں کہ فیض ہمارا ہے۔ فیض ہمارا ہے۔ فیض کے مرنے سے تیسری دنیا اور غریبوں کی یہ غریب دنیا اور غریب ہو گئی ہے۔ ادب، تہذیب، ثقافت کی گود خالی ہو گئی ہے۔ شاعری بے نور ہو گئی ہے۔ بے نواؤں اور بے رداؤں کے سروں پر سے شفقت و مروت کا آسماں سکڑ گیا ہے۔

جو نفس تھا گلو بنا جو اٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاط آہ سحر گئی وہ وقار دست دعا گیا

فیض فلسفے کے اس بائیں جانب اپنی بنیادی قدر حیات انسان دوستی کی راہ سے پہنچے۔ اگر ان کو انسان سے اٹوٹ محبت نہ ہوتی تو وہ ایک مشہور رومانی شاعر کی زندگی جی کر ایک معروف روائتی شاعر کی موت مرجاتے۔ مگر وہ محبت کی بے

بادباں کشتی میں بیٹھ کر ظلم کے جوار بھاٹوں میں اتر گئے۔ اس بحر ظلمات میں جبر کے گھوڑے اور فوجیں بقول ایلیٹ رات کو ہی نبرد آزما تھیں۔ فیض صاحب ظلم و تعدی کے آسمان سے ستارے نوچ کر بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی انسانیت کے قدموں میں ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ استحصال کے چاند ستاروں کو کوٹ پیس کر اور نوالوں میں ڈھال کر اولاد آدم کی تشنہ لبی اور شکم گرسنگی کے آنسو پونچھنا چاہتے تھے۔ وہ پس دیوار زنداں رہے مگر وطن کے لئے روشنیوں کے خواب دیکھتے رہے۔ وہ اپنے آنسوں کے تیشے سے کوہکنی کا کام لینا چاہتے تھے۔

فیض صاحب چھوٹے انسان نہ تھے۔ آدمی کے چھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ بڑا ہونے کا دعویٰ کرتا پھرے۔ چھوٹوں میں بڑائی نہیں سماسکتی۔ اس لئے ان کے مختصر تن سے تڑخ کر باہر نکل آتی ہے۔ مگر بڑوں کے اندر سمندر پہاڑ' جھیل سبھی جذب ہوجاتے ہیں۔ قطرہ اوروں کا بھی دریا ہوتا ہے۔ مگر ان کو تقلید تنک ظرفئی منصور منظور نہیں ہوتی۔ یہی صاحب ظرف لوگوں کا شیوہ ہے۔ فیض صاحب ظرف کے اعتبار سے غالب سے کم نہ تھے۔ غالب دونوں جہاں لے کر شرما رہا تھا۔ کہ تکرار کیا کریں۔ دیکھیں ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے۔ فیض دونوں جہاں ہار کر اٹھ گیا۔ بغیر اف کئے بن آہ کئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہ زنداں نصیب شاعر و فن کار قفس کے جھروکوں سے وطن کی بدنصیب گلیوں میں لاچارگیوں کو بال کھولے روتے دیکھتا تو اس کے دل کا لہو لفظوں میں پگھل پگھل کر آنسوں میں ڈھلتا۔ اس آگ کو وہ شعر کی کٹھالی میں سونا بناتا۔ اس کی تپش کو جھونکا بناکر جھلستی انسانیت کی دھکتی آنکھوں کے لئے مرہم کے

طور پر بھیج دیتا۔ اس کی شاعری میں تبختر نہ تکبر۔ ضد ہے نا ضعف۔ شور ہے نہ شرابا۔ وہ سچا شاعر ہے اور اس سے زیادہ سچا انسان۔ جسکے ہاں غصہ و نفرت محبت کے ریشمی آنچوں میں متغیر ہو کر بڑے بڑے انقلابیوں کے لئے بھی حیرت کا ساماں پیدا کرتے ہیں۔ وہ وطن اور مٹی کا وفادار تھا۔ اس کے نزدیک وطن اور ریاست کے لئے حکومت کی وفاداری اور تابعداری ضروری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وطن کا یہ پیارا اور ریاست کا دلارا حکومتوں کا معتوب رہا۔ وہ جاندادہ ہوائے سرر ہگذار تھا۔ جو غالب کی طرح اپنی نعش کو گلیوں میں کھینچے پھرنے کی سعادت بھی حاصل کرنا چاھتا تھا۔۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے زندہ کلبوت کو بھنبھوڑنے والے اب اس کے پروانے بنے اس کی لاش کو اعزاز سے دفنانے آدھمکے ہیں۔ فیض وطن سے بے لوث محبت کی زندہ علامت تھا۔ ستائش و صلے سے بے پرواہ' وہ وفادار تھا مگر وفا فروش نہ تھا۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
نہیں جانتا دعا کیا ہے

اسے سرخ کہو' یا سبز اس کا رنگ ایک تھا۔ وہ دوغلا و بدرنگ نہ تھا۔ اپنی سوچ کو اپنا عقیدہ بنا کر جینے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ فیض اسی اقلیت کا سرخیل تھا۔ فیض بہت بڑا دانشور فلسفی تھا۔ مگر اسی نے اپنے فلسفہ و دانش کو شعر و شعریت کی راہ میں حائل نہیں دیا۔ بلکہ اکثر اوقات بڑی قربانیاں دے کر ان دونوں کو شیرو شکر کرنے کی سعی کی۔ ان کے ہاں ان کا فلسفہ حیات تغزل کی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حکمت و دانش کی پاسداری کے ساتھ ان کے ہاں غزل کی آب و تاب کسی جگہ مجروح نہیں ہوئی۔ غزل غزل ہی رہتی

ہے۔ شعر شعر ہی رہتا ہے۔ مشاہدہ حق کی گفتگو انہوں نے بادہ ساغر کے انداز میں کی ہے۔ فیض صاحب کسی جگہ مرتبہ شعری سے نیچے نہیں اترے۔

وہ ایک رجائی انسان تھے ۔ ان کی زندگی' شاعری اور سوچ میں رجائیت کی ایک لہر جاری و ساری رہی۔ وہ کبھی بھی دل برداشتہ' کمزور یا بے وزن نہ ہوئے۔ ہر حالت میں اپنی شان وضعداری کو اعلیٰ اسلوب سے نبھایا۔ ان کے اندر اس قدر توانائی تھی کہ وہ کسی مرحلے پر نہ ٹوٹ سکے۔ ہر صدمے کو دل پہ سہا۔ ہر جبر کا مقابلہ صبر کے ساتھ کیا۔ امید کی لو کو بڑھاتے رہے۔ فکر کی ضو چمکاتے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ آخری فتح ضرور حق کی ہوگی۔ وہ جبر کے تماشوں کو فراخئ قلب کے کمال کے ساتھ' ایک شان استغنا کے ساتھ دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ ان کو علم تھا کہ ظلم کی رات آخر کو ضرور غروب ہوگی۔ ان کو تاریخ کا شعور حاصل تھا۔ ان کو پتہ تھا کہ تاریخ اور زمانہ آخرکار انصاف کرتا ہے۔ اس دنیا میں دیر ضرور ہوتی ہے۔ اندھیر نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے بے صبری ہمیں اندھیروں سے ٹکرا دیتی ہے۔ صبر حوصلہ مسکراہٹ اور رجائیت ان کی متاع زیست تھے۔ ان کے سہارے وہ سلیقے سے ناکامیوں سے کام لیتے زندگی کر گئے۔

فیض صاحب آزادی نسواں کے حامی ہونے کے ساتھ خواتین کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اپنی الگ دنیا مت بساؤ۔ مردوں کے ساتھ مل کر کام کرو۔ اپنی آواز کو تحریک بناؤ۔ مردوں کو آزادی ملے گی۔ مردوں کو انصاف ملے گا۔ مرد ایک نئی تعمیر کریں گے تو عورتوں کو بھی اپنے حقوق خود بخود مل جائیں گے

فیض کو سمجھنے کے لئے لوگ کنوں باؤلیوں میں ڈول ڈالتے رہے۔ ان کو

زخم لگا کر ان کی پیمائش کرتے رہے۔ مگر فیض ان کے پیمانوں سے بلند و برتر رہے۔

کیا بھلا مجھ کو پرکھنے کا نتیجہ نکلا
زخم آپ کی نظروں سے بھی گہرا نکلا

فیض صاحب کی داستان عشق ختم نہیں ہوئی۔ یہ سلسلہ تو آگے چلتا رہے۔ یہ چراغ ہمیشہ جلتا رہیگا۔ اگرچہ ایک عارضی جدائی ہے۔ مگر فیض کا آئیڈیل زندہ ہے۔ ان کی سوچ اور ان کا شعر زندہ ہے۔ فیض زندہ رہے گا

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستان عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

فیض و ایوب مرزا۔ یک جان دو قالب

فیض تو ادب و سیاست کے میدان میں کبھی اجنبی نہیں رہے۔ وہ امر ہیں۔ جب تک اس دھرتی پہ غریب و لاچار اور ان کا نام لینے والے زندہ رہیں گے فیض کبھی اجنبی نہیں ٹھہریں گے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا البتہ ادب کی دنیا میں اجنبی تھے اور یہ اسی چیز کا احساس تھا جس نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی انتہائی خوبصورت کتاب کا نام "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" رکھوایا۔ مگر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ ایک ہی جست میں بے کراں وسعتوں کو پاٹ کر ادب کی پہلی صفوں میں پہنچ گئے۔ ایوب مرزا فیض کے ساتھ گندھ اور بندھ گئے ہیں۔ شاندل کا کہنا ہے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی بڑے آدمی میں زندہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض کے اندر سانس لیتے ہیں۔ اور اس کتاب کے بعد تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے انہوں نے فیض کا قرض ادا کر دیا ہو۔ اور فیض ایوب مرزا کے ساتھ سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ایوب مرزا کا ذکر اگر فیض کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔ تو فیض کا ذکر بھی کبھی ہم کہ ٹھہرے اجنبی کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔ پرانے زمانے میں

کہا جاتا تھا کہ فلاں جن یا دیو کی جان فلاں طوطے مینا یا کبوتر میں ہے۔ آج اگر چہ ایسا نہ بھی کہا جائے کہ فیض کی جان ایوب مرزا میں تھی۔ تو یہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ایوب مرزا کی جان فیض احمد فیض میں تھی۔ جسے روزن دیوار زنداں بجھاکر محبوب کی مانگ میں ستارے بھرنے والا محبوب اپنے ساتھ لے گیا ہے یہاں تو فیض کے نام کا ایک چراغ جل رہا ہے۔ جسے دنیا اپنی سہولت کے لئے ڈاکٹر ایوب مرزا کے نام سے پکارتی ہے۔ یہی فائدہ ہوتا ہے بڑی سرکاروں سے اپنی ذات کو منسلک کرنے کا۔ فیض کا غم بڑا تھا۔ اس کے غم کو جاں کی تلاش تھی۔ سو وہ غم گسار بن کر چلا گیا مگر ادب کی تاریخ سے نکل کر انسانوں کی تاریخ میں داخل ہوتے وقت وہ سخن ہائے وفا کے ساتھ ایوب مرزا کو بھی ساتھ لے گیا۔ سو ایوب مرزا بقائے دوام کے دربار میں بھی فیض کے قریب ہی بیٹھے ہیں۔

باسول نے جانسن کی بایوگرافی لکھ کر دنیا کو چونکا دیا تھا۔ اور جانسن کے ساتھ خود بھی امر ہوگیا تھا۔ حالی نے سرسید کو حیات جاوید کا تحفہ بخشا۔ دونوں امر ہیں۔ رہیں گے۔ ہمارے ہاں سوانح لکھنے کا فن حالی سے آگے نہیں جاسکا ہے۔ مگر اس فن میں نفاستیں ضرور پیدا کی گئی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی لکھی ہے۔ جو فن سوانح کا ایک بہت بڑا سنگ میل ہے۔ دور جدید میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کی کہانی اسی انداز میں تحریر کی ہے۔ ایوب مرزا کی تخلیق اسی پائے کا ادبی کارنامہ ہے۔ مگر

یہ اس معنوں میں اس سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ عصر جدید کی سیاسی معاشی و نفسیاتی تحریکوں کا احاطہ بھی کرتی نظر آتی ہے۔ یہ تاریک راہوں میں مارے جانے والے روشنیوں کے مسافروں کا سفرنامہ بھی ہے۔ فیض پر لکھی جانے والی جملہ تحریریں ایک طرف اور صرف یہ کتاب دوسری طرف۔

یہ تصنیف داستان' ناول' ڈرامے' افسانے' انشائیے' شاعری' سوانح' تاریخ' فلم سب کا مزا دیتی ہے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح ایوب مرزا کا قلم یہ سب کچھ کر کے بھی لرزاں ہے۔ اور بار بار فیض کا واسطہ دے دے کر کہتا ہے کہ مجھ کو شاعر نہ کہو۔ میر کہ صاحب ہم نے درد دل جمع کئے کتنے تو دیوان کیا۔ درد دل کا یہ مجموعہ فیض اور اس کے عہد کی جیتی جاگتی تاریخ ہے۔ یہ تصنیف فیض کے ارد گرد نہیں اس کے اندر سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے وہ باتیں بھی کم گو اور خود فراموش فیض سے کہلوائی ہیں۔ جن کا سارے فسانے میں کہیں ذکر نہ تھا۔ اور جن پر منٹو کی فحاشی کی طرح مقدمے بھی بنتے رہے۔ تعزیرات و تحدیرات شعر و سخن کے کارن فیض جہاں شاعری میں پورا نظر نہیں آتا۔ وہاں وہ اس کتاب میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ کاش فیض کتاب کے اوریجنل سکرپٹ کے کچھ حصے کو قلم زد نہ کرتے۔ وہ حصہ ضرور ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود ہوگا۔ تاریخ یہ چاہے گی کہ اسے بھی منظر عام پر لایا جائے۔ کیونکہ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ فیض کے پاس چھپانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ وہ کون سی ایسی باتیں ہیں جسے فیض جیسا آدمی بھی چھپانا پسند کرتا ہے۔ فیض کے چاہنے

والے اس تحریر کے منتظر رہیں گے

ہم کہ ٹھہرے اجنبی کے مطالعے کے دوران یہ پتہ نہیں چلتا کہ فیض اور ایوب مرزا الگ الگ کہاں ہوتے ہیں۔ یہ ایک کیمیائی محلول ہے۔ جو "من تو شدم تو من شدی" کا مزہ دے رہا ہے۔ اور اس نے کتاب کو ایک جاسوسی ناول بنادیا ہے۔ جس کو ایک ہی نشست میں ختم کرنے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔ یہ فیض کی شخصیت کا کرشمہ ہے یا ایوب مرزا کے اسلوب کا کمال یہ ابھی طے نہیں ہوسکا۔ فیض کے قرب نے ایوب مرزا کے قلم و ذہن کو بھی اس سحر میں رنگ دیا ہے۔ جو فیض جیسے لوگوں کا حصہ ہے۔ ایوب مرزا کا کہنا کہ شاعری میرے قریب سے نہیں گزری۔ زیادہ صحیح نہیں۔ فیض کی محبت و صحبت میں زندگی گزارنے والا کس طرح یہ دعویٰ کرسکتا ہے ۔ واقعی شاعری گزر کر چلی نہیں گئی۔ ان کے پاس ہی رہی فیض کی زندگی خود ایک انقلابی شعر ہے جو زمانے کے لبوں پہ اور ایوب مرزا کی آنکھوں میں سجا ہے۔

ایوب مرزا نے فیض کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ اور فیض صاحب ایلس فیض، سلیمہ اور میزہ کی زبانی بہت سی باتیں کہلوائی ہیں۔ ہر باب ایک الگ افسانے کا رنگ روپ لئے ہوئے ہیں۔ اشعار، ان کے پس منظر، خیالات، نظریات کی بحثیں غلط فہمیوں کے ازالے، الزامات کے جوابات، جیل یاترا کے قصے، دوستوں رفیقوں کی باتیں، خاندانی حالات واقعات، اچھے دن برے دن، ھنسنے رونے کی

باتیں غرض ایک جہاں فیض آباد ہے۔ جس میں اترتے جائیں چلتے جائیں لطف اٹھاتے جائیں۔ وقت زمانے، تسلسل، ترتیب کی قید سے آزاد، زندگی کی طرح، زندگی سے بھرپور، فیض اور اس کے غم سے معمور۔

شعروں سے گونجتی بجتی یہ تحریر ایوب مرزا کے اسلوب کا شاہکار ہے۔

اسے نہ پڑھنے والا کبھی فیض سے پوری طرح سے آشنا نہ ہوگا تو وہ اس صدی، عہد، شعور اور پاکستانی تاریخ کے چالیس سالوں سے آشنا نہیں ہوگا۔ اور یقیناً" وہ ایوب مرزا سے بھی آشنا نہ ہوگا۔ یہی ایوب مرزا کا کمال فن ہے۔ ایوب مرزا جو کسر نفسی میں اپنے آپ کو شاعر و ادیب ماننے سے منکر ہیں بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ بڑا اعلیٰ اسلوب رکھتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے زندہ تحریریں یاد چھوڑتے۔ مگر اپنے آپ کو منوانے میں وقت لگتا ہے۔

ایوب مرزا نے خوبصورت شارٹ کٹ استعمال کیا ہے۔ فوری پذیرائی کا کامیاب نسخہ۔ مگر یہ ادب عشق بن نہیں آتا۔ ایوب مرزا کو ہی یہ حق پہنچتا تھا۔ کہ وہ فیض کے ملفوظات کو تاریخ کے حوالے کریں۔ انہوں نے افسانہ گھڑا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے وقت کے ایک افسانے ایک لیجنڈ کے گلے میں یادوں کے پھول ڈالے ہیں۔ اس کے گھر میں چراغاں کیا ہے۔ سورج کے گرد چراغ جلانے کی شرارت کی ہے تاکہ اس کو بجھانے والے جن بھوت بھاگ جائیں۔ فیض کی کی یادوں کا ہالہ تاریخ کا حوالہ بن گیا ہے۔ تاریخ جھوٹ نہیں بولتی، فیض نے بھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ ایوب مرزا نے اس سچ کو قلمبند کردیا ہے۔

فیض نے ہمیں یہاں تک بتادیا ہے کہ اُس کے والد مویشی چراہا کرتے تھے۔ پھر بعد میں آکر شہر کی ایک مسجد میں پناہ گیر ہوئے۔ شام کو سٹیشن پر قلی کا کام کرتے تھے۔ دن کو پڑھتے تھے ۔ پھر ہوتے ہوتے افغانستان پہنچے اور وہاں چیف سیکرٹری اور سفیر کے عہدے تک جاپہنچے۔ فیض کے والد نے پھر بہت دولت کمائی۔ زمینیں خریدیں۔ فیض نے پھر بتایا کہ وہ ایک دن پٹواری اور تحصیل دار کو لے کر گاؤں پہنچے۔ اور اپنے حصے کی ساری زمین عزیزوں اور مزارعوں میں تقسیم کردی۔ اور پھر فیض نے ہمیں بتایا کہ اس کی ماں جب گاؤں گئی تو اس کا سواگت برصغیر کی سب سے بڑی چوہدرانی سے بڑھ کر ہوا۔ اس کے بعد اس کی ماں اسے محبت سے چوما کرتی تھی۔ پھر جب گورمانی نے بار بار اصرار کیا کہ ہمارے پاس بہت سی متروکہ زمین پڑی ہے۔ الاٹ کروالو۔ تو فیض صاحب یہ کہتے نظر آتے ہیں۔ میں نے ایک عذاب سے نجات حاصل کی ہے۔ آپ پھر مجھے اسی میں دھکیل رہے ہیں۔ گورمانی نے کہا کہ تم پاگل ہوگئے ہو۔ فیض نے کہا کہ میں واقعی پاگل ہوں۔ اس پاگل فیض کا پتہ ہمیں ایوب مرزا بتاتے ہیں۔ ایوب مرزا یہ بھی بتاتے ہیں کہ کارٹونسٹ انور عرف ننھا جب لاہور کی اشاعتی گلیوں میں فیض کی نظم بیچنے نکلتا تو کباڑ خانوں کے ناشر کہتے " آپڑے بچیاں دا خیال نہیں تے ساڈھے بچیاں دا خیال کرو " پھر کوئی جوانمرد ناشر بے خطر اس آگ میں کود پڑتا۔ اور دس بیس روپے میں فیض کی غزل لے اڑتا۔ اور فیض کو اطلاع ملتی کہ آج ان کی تخلیق دس روپے میں زندہ دلان لاہور کے

شہر کے ناشروں نے خریدی ہے۔ اور یہ روپے بحفاظت ایلس تک پہنچ گئے ہیں۔ تو فیض اس بچے کی طرح سکون و آرام کی نیند سو جاتے تھے۔ جس کے کان کا درد ٹھیک ہوجائے۔ فیض صاحب کا وہ تعجب و تحیر بھی ہمیں اسی کتاب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہ جب ان کے صیاد انہیں گرفتار کرنے آتے تو فیض کہتے بھئی دیکھو ہم تو ہر طرح تیار ہیں۔ ذرا ایلس کے غصے کا برا نہ منانا۔ اسے ہماری خاطر معاف کر دینا۔ فیض صاحب کبھی کبھی ضرور ایوب سے کہتے کہ یار وجہ بلا وجہ ملک میں کچھ ہو۔ ہم جیل خانے پہنچادئے جاتے ہیں۔ ہم کوئی چور اچکے قاتل ہیں۔ پھر فیض کو اس وقت تسکین ملتی ہے جب اسے تانگے میں بٹھا کر پا بہ جولاں جیل لے جایا جاتا۔ اور لوگ تانگے کے گرد جمع ہو کر نعرے لگاتے۔ فیض کا دل گواہی دیتا ہے کہ گلے سڑے نظام کے وارث سریر آرائے سلطنت ہو کر بھی عوام سے دور اور گھٹیا ہیں اور پھر یہ نظم طلوع ہوتی ہے۔

آج بازار میں پا بجولاں چلو
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہر جاناں میں اب باصفا کون ہے
دست قاتل کے شایاں رہا کون ہے۔
رخت دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

ایوب مرزا کی گواہی پر ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فیض فلسفے میں داخلہ اس لئے نہ لے سکے کہ ان کے پاس داخلے کے 109 روپے نہ تھے۔ اور 9 روپے داخلے والے ایم اے عربی میں داخلہ لے لیا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اسی عربی بل بوتے پر وہ کامریڈ عطا کے لڑکے کا نکاح پڑھاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ فیض ڈاکٹر رشیدہ جہاں کے سامنے محبت کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہیں تو انہیں کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھنے کا مشورہ ملتا ہے۔ اور فیض پکار اٹھتے ہیں کہ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ مرزا ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ فیض کسی زمانے میں ڈاکیوں کی یونین کے صدر بھی رہے ہیں عجیب قلندر آدمی تھا۔ 2500 کی کرنیلی چھوڑ کر ایک ایک ہزار کی ایڈیٹری کی حامی بھرلی۔ ایوب مرزا ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ 1971 کے سانحے کے موقع پر فیض کی کیا حالت ہوئی تھی۔ کمرے میں سناٹا تھا بتیاں گل تھیں۔ اور فیض بستر پر اوندھے لیٹے سرچادر سے غرور جبین سجائے ہوئے تھے۔ اسی موقع پر یہ نظم تخلیق ہوئی تھی۔ حذر کرو میرے تن سے یہ سم کا دریا ہے

کتاب کے لفظ لفظ سے فیض کے اندر کا انسان جھانکتا ہوا ملتا ہے۔ کبھی سرمایہ داری نظام پر برستا ہوا تو کبھی ملا و جاگیردار کے لئے لیتا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داروں نے اس حکم پاک سے کہ اگر ہمسایہ بھوکا ہے تو تم پر روٹی حرام ہے بچنے کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ گلبرگ اور ڈیفنس کالونیوں میں مکانات بنوالئے ہیں جہاں بھوک کا داخلہ ممنوع ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ عوام کو اصلاح

نفس اور تطہیر ضمیر کے بے مغز لیکچر عنایت کرنے سے بہتر ہے۔ انہیں دو وقت روٹی دے کر ان کا نفس اور ضمیر زندہ رکھیں۔ اگر خالی گھر میں دیو گھستا ہے تو بھوکے انسان کے ذہن میں ضرور شیطان جگہ بناتا ہے۔ یہ بات بھی ایوب مرزا کے حوالے سے دنیائے ادب کے سامنے آئی ہے کہ 1965 کی جنگ میں فیض سرکاری سطح پہ بلامعاوضہ ابلاغ کے محاذ پر برسرپیکار تھے۔ البتہ وہ ٹاٹا برلا ڈالمیا کو سہگل ، آدم جی اور داؤد کو ایک ہی خاندان کے افراد سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ جغرافیے کی لکیر کے کسی بھی طرف ہوں۔ فیض صاحب ٹھنڈے مستانے آدمی تھے۔ مگر نظریاتی محاذ پر اٹل اٹوٹ امٹ۔ وہ درگزر کے بادشاہ تھے۔ مگر ایوب مرزا ہمیں بتاتے ہیں کہ نظریاتی محاذ پر ا نکمپرومائزنگ تھے۔ فیض کا کہنا تھا کہ ایسی بزدلی اور کمزوری ناقابل معافی ہوتی ہے۔ اور ایسا درگزر عوامی تحریکوں کے لئے سم قاتل ہوتا ہے۔ جو مظلوم نادار اور لٹے ہوئے عوام کے درخشاں مستقبل کی داعی قوتوں سے غداری کرے۔ مقابلہ تو کرنا ہوگا۔ اس مقابلے میں فرد تنہا بھی ہوسکتا ہے۔ اور منظم تحریک بھی۔ اس جنگ میں ایک طرف تاریکیوں کے پجاری و محافظ پرانے استحصالی نظام کو بچانے وجاری رکھنے کی خوفناک سازشیں کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف نہتے عوام صدیوں کے بہیمانہ ستم کے تلے سسک رہے ہوتے ہیں۔ مگر فتح ہمیشہ سچ کو ہی ملتی ہے۔ اس لئے جنگ جاری رہنی چاہئے۔ طبقاتی جدجہد میں حصہ لینا دشوار نظر آئے تو طبقاتی شعور کی شمعیں جلاتے رہنا چاہیئے۔ یہ بھی جنگ کا اہم حصہ ہے۔ فیض عوام کی

بالادستی کے لئے اذیت کشی کو ایک ہتھیار گردانتے تھے۔ یہ بھی ایوب مرزا کا نتیجہ فکر ہے فیض طبقاتی جدوجہد کا ایک اہم پہلو بھی ایوب مرزا کے حوالے سے سامنے لاتے ہیں کہ اس جدوجہد کو غلط راہوں پر ڈالنے کیلئے CIA (سی آئی اے) نے پچاسوں جعلی سوشلسٹ تخلیق کرکے تاریک راہوں میں بٹھا دئے ہیں وہ ایسے گلے پھاڑ کر واویلا کرتے ہیں کہ اصلی کامریڈوں کی بھی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

اس کتاب میں ادبی حوالے بھی بے شمار ہیں۔ انجمن ترقی پسند مضامین کی اندرونی باتیں ہیں۔ علامہ اقبال کو ڈیمالش کرنے کا ذکر ہے۔ فیض بتاتے ہیں کہ ایک روز مظہر علی خان کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی۔ صفدر میر صدر تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے علامہ اقبال کے خلاف بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہم نے کہا بھئی یہ کیا کرتے ہو اور اس کے بعد ہم ان کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے۔ منٹو کو ڈھانے کاروبار سراغ ملتا ہے۔ فیض بتاتے ہیں کہ ''منٹو میرا شاگرد تھا کالی شلوار' ٹھنڈا گوشت' بو اور دھواں پہ مقدمے ہوئے۔ تین مرتبہ ہم اسے چھڑانے لائے۔ چوتھی مرتبہ سرکار نے منٹو سے پہلے بندوبست کردیا۔ ہم جیل خانے گئے اور منٹو کو قید ہوگئی۔''

ایوب مرزا کی کتاب پڑھتے جائیں فیض کی محبت پاؤں کی زنجیر بنتی جائے گی۔ فیض کا بچپن' جوانی' بڑھاپا متحرک تصویروں کی مانند ذہن کے پردے پر منتقل ہوتے جائیں گی۔ یوں لگے گا کہ جیسے ہم نے صدیاں فیض کی صحبت

میں گزاری ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کہ جن کا ذکر بے معنی نظر آئے۔ مگر ایوب مرزا نے ان جزئیات سے ہی ایک جہاں فیض تعمیر کیا ہے۔ ایک ایسا شیش محل جس کی ہر کرچی میں فیض میں فیض ہی فیض نظر آتا ہے۔ اس میں بڑی بڑی باتیں بھی ہیں۔ روس ' چین و امریکہ کی باتیں ' نو آبادیات اور سامراجیت کے ٹاکرے 'فلسفہ وجودیت و مارکسزم کی بحثیں ' ادب و شعر کے قضیئے۔ چاچیوں اور پھوپھیوں کی چمکاریں ' روس نوازی ' چین نوازی اور بھارت نوازی کے غیض آور اعتراضات اور جوابات۔ فیض کی مدھم جھلاہٹیں ' ایوب مرزا کے کچوکے اور فیض کے دل و ذھن کی واشگافیاں ' ایذا پسندیاں اور کرم فرمائیاں۔ کتاب کیا ہے ' آئینہ خانہ ہے۔ انکشافات اور اعلانات کا۔ دور جدید کے ایک بہت بڑے دانشور کا نامہ اعمال بھی ہے۔ اور فرد جرم بھی۔ خوبصورت جملوں کی ایسی دھوپ چھاؤں ہے کہ سمجھ نہیں آتی کہ اس کی داد کس کو دی جائے۔ ایوب مرزا کو کہ فیض کو۔ ٹیپ ٹرانس کرائب ہوا ہے تو فیض کا کمال ہے۔ یادداشت سے لکھا ہے۔ تو بلے او بلے ایوب مرزا کی۔ یہ جملے اتنی آسانی سے نہیں بنا کرتے۔ "مجھے اس کم عمری میں ہی احساس ہوا کہ شہزادہ اور شہزادی بننا کتنا آسان ہے۔ بس کسی بادشاہ کے نطفے کی ضرورت ہے مگر محبت و ایثار کے پتلے بننے کے لئے کتنی محنت و کاوش اور قربانی درکار ہے" (صفحہ 28)۔ فیض کے منہ سے نکلے ہوئے پھول ہوں یا مرزا کے قلم سے نکلی پھلجھڑیاں۔ قدم قدم پر خوبصورت ' معنی خیز جذبوں سے معمور باتیں جن میں

رنگ بولتے بھی ہیں۔ اور خوشبو بھی پھیلاتے ہیں۔ ایوب مرزا کا اسلوب آنسوؤں کی غذا پاکر جذبات کا چراغاں سجاتا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شعر نثر کے آنگن میں اتر کر نظم کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے مچل رہا ہے۔ ملاحظہ کر لیں چند جملے

"بالآخر پنجاب اور سندھ کے دریاؤں میں آب و رقص دیوانگی کے ساتھ بربادی کے ساز پر چیختا ' پانیوں کی ہولناک طغیانی' دیو صفت اٹھتی ہوئی لپکتی اور بڑھتی ہوئی موت کی پیام بر لہروں کی آب و تاب میں گرتا' پڑتا' چلاتا' ریزہ ریزہ ہوکر بحیرہ عرب کے وسیع و قلب میں ابدی نیند سوگیا۔۔۔۔۔ آسمان کسی بے رحم پروھت کی طرح ان پر مزید باران رحمت کی بوچھاڑ کررہا تھا۔ شاید ان لاچار افلاس زدہ اور بھوکے ننگے ڈھانچوں کو اس لئے غسل دے رہا تھا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کیا چاھتی ہے۔ تاکہ یہ آخری غسل ان کی روح کو نجس ڈھانچوں سے بہا کر سوئے آسماں لے جائے۔ کیونکہ عیسیٰ کی طرح یہ بھی ظلم سہنے کے آخری امتحان میں پاس ہو چکے ہیں" (صفحہ 150)

"ان ماؤں کی سوکھی ہوئی پژمردہ چھاتیوں میں نہر شیر کیسے رواں ہو۔ اور نڈھال بلبلاتے ہوئے لاغر بچوں کے جسم کی توانائی ' ان کی آنکھوں کی رونق ' گالوں کی لالی اور بچپن کا معصوم

حسن انہیں کون واپس دے گا۔ ان کی نجات کے رہبر، مبلغ، مجاور، محافظ، اندھی طاقتوں سے شیروشکر ہیں۔ جنھوں نے ماوں کی چھاتیوں کا شیر خشک کیا ہے۔ جنھوں نے معصوم بچوں کو معصومیت کے حسن سے محروم کیا ہے۔ ان راھبروں کے ہاتھوں میں کوئی تیشہ نہیں۔ ان کے دراز ہاتھوں میں پرمٹوں کی بھیک کا کشکول ہے۔ ایک ہاتھ میں پرمٹ اور دوسرے ہاتھ میں نجات مانگنے والوں کے خلاف فتوے" (154)

ہم کہ ٹھہرے اجنبی: "میں ایوب مرزا نے ایک سچے عاشق کی طرح اپنے آپ کو پس منظر میں رکھ کر اجنبی ٹھہرانے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ تحریر "میں" کی خود افروزی سے پاک ہے۔ فیض کے سر پر رکھ کر اپنا سودا بیچنے کی کوشش کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے دیوتا کے چرنوں میں داسی عقیدت کے پھول خاموش نگاہوں اور دلفریب اداؤں کے ساتھ رکھتی جارہی ہے۔ پھر اتنے پھول جمع ہوگئے کہ مظلوموں اور معصوموں کی راہ سے کانٹے چننے والا فیض پھولوں کی سیج پہ مہکتا دکھائی دیا۔ اس بھرپور جامع اور زندہ تصنیف کے اندر فیض اپنی پوری توانائی کے ساتھ حالات و واقعات کے ساتھ پنجہ آزما نظر آتا ہے۔ اسلوب میں فیض کے لہجے کا محبوبانہ اور قلندرانہ بانکپن اپنی پوری معصومیت کے ساتھ جمال آرا ہے۔ "بھئی وہ آئے ہمیں کہا چلو اور ہم چلے گئے۔ بھئی ہم لڑنے اور بحث کرنے والے آدمی

تھوڑے ہیں۔ بھئی یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم سے کج بحثیاں نہیں ہوتیں۔ بھئی جب سارا ملک جیل ہو تو کسی ایک خاص کمرے میں جانے میں کیا حرج ہے۔ بھئی بھئی کا استعمال فیض کو سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ کتاب کے بعض حصے تو ڈرامائی حسن کو بولتی تصویریں ہیں۔ جس جگہ چھیمی کے تاثرات کو قلمبند کیاگیاہے۔ وہاں اسلوب بیان شعری ساعتوں میں سے گزرتا مابعد طبیعاتی رفعتوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

"چھیمی نے اپنے حلق میں اٹکا ہوا احساس محبت نگلا۔ نمدار آنکھوں کی پلکیں جھپک کران کو خشک کرنے کی کوشش کی۔ غالباً" ان آنکھوں میں اس کی وژن پھیل چکی تھی۔ میں اس کو سامنے بیٹھا نظر نہیں آرہا تھا۔۔۔ بولی Passion۔۔۔۔۔۔ Passion ؟ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کیا یہ وہ گیت ہے جو عیسیٰ کے سولی پر چڑھتے وقت گایا جاتا ہے۔ یا وہ قوت ہے جو ایذارسانی کا تریاق ہے یا وہ بحر محبت جس کا کوئی کنارا نہیں۔ یا اس دہشت بے آب و گیاہ میں ایک وایلا ہے۔ جسے گوش وقت حاضر سننے اور سمجھنے سے قاصر ہے" (صف 169)

ایوب مرزا جہاں جہاں فیض کے حضور میں ہوتے ہیں۔ وہاں لہجہ و اسلوب کی مہار فیض کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور ایوب مرزا فرط احترام و محبت میں دھیمے سروں میں سرتاپا سماعت ہوتے ہیں۔ اور ان کے اپنے اسلوب کی خطیبانہ سخاوت منقار زیر پر رہتی ہے۔ مگر فیض کے سامنے سے ہٹتے ہی ان کا اسلوب

تخلیقی چوکڑیوں کے چوکے چھکے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اور وہ پچھلی سیٹ سے اگلی ڈرائیونگ سیٹ پر آجاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ایک اور انداز " ایسا لگ رہا تھا کہ آسماں اس ملک اور اس ملک کے دھقانوں کی قسمت اور اس ملک کے دانشوروں کی دانش پر گریہ کناں ہے۔۔۔۔ کہیں کہیں روشن قمقموں کے گرد بارش کے قطرے رقص دیوانگی میں پروانہ وار شہید ہو رہے تھے۔ اور فیض کا شعر بھی (پروفیسروں کے ہاتھوں) شہید ہو چکا تھا " ایوب مرزا نے جہاں فیض کی جراتوں کے گن گائے ہیں۔ وہاں اپنی بے حسی اور بزدلی کا اعتراف کرنے کی اخلاقی جرات کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

" مگر ہم میں شائد اتنی ہمت نہ تھی کہ وطن لوٹ کر اس ظلم اور اس بہیمانہ نظام کے خلاف جدوجہد میں شریک ہوتے۔ دوسرے اس مرد تنہا کی جرات بے پاک پر حیران و ششدر تھے۔ کہ یہ بظاہر جو نہ گاماں پہلوان ہے نہ رستم زماں۔ جس کے پاس ہمت و جرات کا ستارہ ہے نہ چاند۔ ایسے اس آگ میں کود رہا ہے۔ جیسے ابراھیم نمرود کی آگ میں بے خطر کود گئے "

ایوب مرزا کو اپنی کوتاھیوں کا پورا احساس ہے۔ اسی لئے اہل زبان اور زبان داں دونوں سے معافی چاھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور اس کے ساتھ میرا سلوک ایسا ہی ہے جیسا دیگر قومی معاملات کے ساتھ۔ ایوب مرزا کی کسر نفسی بجا۔ مگر انھوں نے کمال معصومیت اور بے غرضانہ طریقے پر اس قومی زبان میں ایک قومی ھیرو کی داخلی زندگی کا نظارہ پیش

کردیا ہے۔ جس کے دوزخ میں انہوں نے اپنی کتنی جنتوں کے جنازے جلا
ڈالے تھے۔ جو دونوں جہاں ہارے بھی کچھ نہیں ہارا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کی
محبتوں کے جہاں اب بھی ان کے تعاقب میں یہی جہاں خستہ ایوب مرزا کے
لئے چشم براہ ہے

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری کا نام عہد حاضر کے عظیم ترین شعرا میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ جوش فیض اور حفیظ اور فراق اس عہد نو کے آسمان شعر کے درخشندہ' ستارے تھے جو ایک ایک کر کے بجھ گئے مگر ان کا شعری سرمایہ اردو زبان و ادب کا بیش بہا خزینہ ہے۔ حفیظ جالندھری کو اپنے معاصرین میں یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پاکستان کا قومی ترانہ ان کے قلم کی تخلیق ہے۔ اس ترانے میں انہوں نے انتہائی اختصار اور بھرپور شعری نزاکتوں کے ساتھ وطن کی عظمت اور رفعت کو بیان کر دیا ہے حفیظ صاحب کا ایک اور کمال سخن ان کی مشہور نظم شاہنامہ اسلام ہے جو انہوں نے فردوسی کے شاہ نامہ کے اتباع میں لکھی۔ یہ نظم اردو زبان و ادب میں رزمیہ نگاری کی ایک اولین کوشش ہے۔

حفیظ بنیادی طور پر گیتوں اور نغموں کا شاعر ہے ان کے ہاں موسیقی کی روح رچی بسی نظر آتی ہے۔ ان کے متعلق پطرس بخاری نے لکھا ہے کہ حفیظ ایسا ساحر ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے قدرت کی رنگینیاں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور

غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگتی ہے۔

حفیظ جالندھری نے بہت کچھ لکھا ہے مگر جو نغمگی وارفتگی اور نشیلا پن نغمہ زار میں ملتا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے ان کے دوسرے دو مجموعوں سوز و ساز اور تلخابہ میں بھی اس خمار کی انگڑائیاں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ مگر نغمہ زار سراپا حسن ہے۔ سرور ہے نشاط ہے۔ ڈاکٹر تاثیر نے شاعرانہ لحاظ سے نغمہ زار کو حفیظ کی تمام تخلیقات سے برتر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں نغمہ کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا وہ فن اور نفس مضمون کے اعتبار سے بلند تر، پختہ تر ہے متانت اور علو تخیل۔ لطافت الفاظ سے اس طرح ممزج ہوئے ہیں کہ ادبیات میں ان کا مقام جاودانی ہے مگر جو سبک سیری جو فرحت فزائی نغمہ زار کے الفاظ و معانی اور بحور میں وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ نغمہ زار حفیظ کا شباب ہے۔ اس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں اور جب تک اس معمورۂ دیر پر شباب مسلط ہے اس کا سکہ جواں ہمت دلوں پر جما رہے گا۔ اس مجموعے میں سولہ نظمیں اور 67 غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ کسی بھی نظم یا غزل کو دیکھیں ہر ایک میں وہی شباب کی سرشاری، استغنا اور انانیت نظر آتی ہے۔ ہر نظم شباب کی حسن آفرینی اور جدت طرازی کا نمونہ ہے انہی خصوصیات کی بناء پر نغمہ زار کو نغمہ شباب کہا گیا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" اسی مجموعے کے ماتھے کا جھومر ہے

حسین جلوہ ریز ہوں
ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں
تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر، کوئی ادھر کوئی ادھر
ابھارتے ہو عیش پر تو کیا کرے کوئی بشر
نہیں نہیں ابھی نہیں، ابھی تو میں جوان ہوں

حفیظ جالندھری کو مناظر فطرت کی تصویر کشی پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ نہ صرف منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بلکہ منظر میں جان بھی پڑ جاتی ہے۔ منظر حرکت کرنے لگتا ہے گانے لگتا ہے گونجنے لگتا ہے۔ ان کی منظر نگاری میں جذبات اور حواس کا عمدہ امتزاج بھی ملتا ہے۔

جھاڑیاں کالی روائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

حفیظ کے ہاں تشبیہات ایسی نادر ہوتی ہے کہ دل بے اختیار داد کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو
بن گیا ہے آسمان نتھرے ہوئے پانی کی جھیل

یا کسی ساحر نے ساکن کو دیا دریائے نیل

حفیظ کی تخلیقی سوچ کی ایک نفرادیت یہ ہے کہ وہ سرزمین عرب و عجم کی شعری روایتوں سے سیراب ہونے کے ساتھ اپنی دھرتی اپنی زمین اپنے اردگرد پھیلی حقیقی زندگی اور اس کی بوقلمونی کو بھی اپنے شعرو سخن میں مہک بھر دیتے ہیں۔ وہ روایت پسند ضرور ہیں مگر روایت پرست ہرگز نہیں۔ مناظر فطرت کی عکاسی کے وقت وہ اس حقیقت کہ فراموش نہیں کرتے کہ وہ کہاں ہیں کس زمین پہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں مقامی رنگ قدم قدم پر جھلکتا ہے بقول پطرس بخاری ان کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری کے اکثر مناظر ایشیائی ہیں۔

وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور راوی کی سنہری نقرئی لہروں میں جنگ
شام آئی ہے سکوں کے جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

ان کی نظموں میں ڈرامائیت کا عنصر بھی وافر ملتا ہے۔ ہر نظم میں حقیقت افسانے کے جال بنتی ہے پھر یہی افسانہ لفظوں کی ناؤ میں سوار حرکت کی شمعیں جھلملا دیتا ہے۔ جذبے، سوچیں حقیقتیں آپس میں اس طرح شیر و شکر ہوتے ہیں کہ نظم شہد کا پیالہ بن جاتی ہے۔ نظم "طوفانی کشتی" میں سرزمین پنجاب

کی رومان پرور سرزمین کے غموں خوشیوں، دکھوں، سکھوں کی دھوپ چھاؤں کے مناظر بڑی خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔

حفیظ کے ہاں ترنم اور تغزل بانہوں میں بانہیں ڈال کر خوش فعلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ موسیقی ان کی ہر مصرعے کی جان ہے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں بربط کی نغمگیاں بھری ہوتی ہیں۔ ان کے اشعار ستار کے تاروں کی طرح کسے ہوئے بجتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نغمہ و شباب کا یہ کھیل نغمہ زار کے سمن راز میں آنکھ مچولی کھیلتا نظر آتا ہے۔

نظموں کے ساتھ ان کی غزلوں میں بھی یہی جذبہ و جوش رنگ و نغمہ، ترنم و تغزل، خوشبو دیتے نظر آتے ہیں۔ غزلیں گیتوں کا رنگ ڈھنگ رکھتی ہیں ہر غزل یوں لگتا ہے کسی خاص دھن پر تیار کی گئی ہے۔

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ
دیکھو تو ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں
جاؤ ! کہ تم نہیں ہو میرے اختیار میں

ان کی غزلوں میں نظموں کی سی روانی اور تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔ پیمانہ غزل کا ہوتا ہے زور بیان اور جذبوں کی منہ زوری نظموں کی ہوتی ہے۔ نغمہ زار کی غزلوں میں وہ سنجیدگی ٹھہراؤ سکون اور افسردگی نہیں ہے جو میر و مومن کی غزل کا طرہ امتیاز ہے۔ ان کی غزلوں میں حدت اور آنچ کا دھیما پن نہیں بلکہ ایک

جارحانہ سرخوشی و سرمستی ہے جو سننے والے کو مسحور کرے نہ کرے مسرور ضرور کر دیتی ہے۔ خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے روح پر سے ملال کی چادر اتر جاتی ہے آنسوؤں، شراروں اور گردش دوراں کا زور ماند پڑ جاتا ہے۔

فلک سے آج شور نعرہ مستانہ آتا ہے
کوئی مئے نوش بادل جانب مئے خانہ آتا ہے

البتہ نغمہ زار ہی کی غزلیات میں وہ رنگ ضرور ملتا ہے جو آگے چل کر حفیظ کی غزل میں انفرادیت کا رنگ پیدا کر گیا جنون شوق کو جب تجربے مشاہدے اور شعور کی مہمیز ملی تو پھر غزل کے اندر ملول لہجے کا دیپ جل اٹھا۔

باغ ہستی میں عجب شے ہے نہال آرزو
جس قدر بڑھتا گیا یہ بے ثمر ہوتا گیا

یہ کس نے بجلیاں بھر دی ہیں یارب میرے شیوں میں
لگے آگ اس محبت کو لگا دی آگ سی تن میں

بحیثیت مجموعی نغمہ زار ایک خوبصورت مجموعہ شعر ہے جس میں شاعر نغمہ کی جوانی بند ہے۔

انارکلی اور امتیاز علی تاج

مسلم ادب و ثقافت میں ڈرامے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے مگر ہندوستان میں ڈرامے کی روایت بہت قدیم ہے۔ کالید اس کے شہرہ آفاق ڈرامے شکنتلا سے ہوتا ہوا یہ تسلسل اندر سبھا تک پہنچتا ہے۔ انیسویں صدی میں تھیٹر کے رواج کو فروغ ہوا اور پارسی کمپنیوں نے اس سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں فلموں کا طوطی بولنے لگتا ہے جس کی وجہ سے ڈرامے کا زور کسی حد تک ٹوٹنے لگا۔ پھر بھی، احسن، بیتاب اور آغا حشر جیسے ڈرامہ نگاروں نے ہندوستانی ڈرامے کی دنیا میں نمایاں ترقی کی۔ جو ڈرامہ سٹیج ہوتا اس میں مقامی اثرات اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم کی وجہ سے نئے نئے عناصر شامل ہوتے گئے۔ اچھے اچھے ادیب شاعر و فنکار اس فن کی طرف رجوع کرنے لگے۔ عصر جدید کے کلاسیکی ڈرامہ نگاروں میں دو نام ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے جائیں ان میں ایک نام آغا حشر کا ہے ان کو اردو کا شیکسپئیر بھی کہا جاتا ہے اور دوسرا نام سید امتیاز علی تاج کا ہے۔

سید امتیاز علی تاج کے ڈرامے انارکلی کو اردو ڈراموں کا تاج کہا جا سکتا

ہے۔ امتیاز علی تاج نے یوں تو بہت سے افسانے ڈرامے اور تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں۔ مگر جو شہرت و مقبولیت انار کلی کو حاصل ہوئی۔ وہ شاید ہی کسی ڈرامے کو حاصل ہوئی ہو۔ امتیاز علی تاج اس ڈرامے کے علاوہ اور کچھ نہ بھی لکھتے تو وہ اسی قدر شہرت و اہمیت کے حامل ہوتے۔ اس ڈرامے پر بہت ساری فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ ہندوستانی فلم مغل اعظم اس سلسلے میں سب سے نمایاں کوشش ہے۔

تاج کے اس ڈرامے کی کہانی مغل تاریخ کے عرصہ عروج کے ایک افسانے (لیجنڈ) پر مبنی ہے۔ انار کلی ایک افسانوی کردار اور واقعہ ہے جس کی تاریخی صحت اور صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے ابھی شواہد موجود نہیں ہیں۔ لاہور کے انار کلی بازار اور اس میں پائی جانے والی انار کلی کی قبر کے بارے میں وثوق سے کہنا آسان نہیں ہے۔ ایک روایت ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آئی ہے۔ اور ایسی ہزاروں رومانوی داستانوں کی طرح فلسفہ اور منطق اور تاریخ و تحقیق کی گواھیوں سے آزاد ہیں۔ یہ روایت مغل عہد کے ہندوستانی لوک قصوں کی مانند صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئی جب امتیاز علی تاج کے فنی شعور اور قلم کی معجزہ کاری سے ملتی ہے تو انار کلی جیسا فن پارہ جنم لیتا ہے۔ جس کی فنی چمک اور تاثیر روز تخلیق سے آج تک قائم ہے۔ انار کلی کا کردار افسانوی سہی مگر اکبر اعظم اور جہانگیر کے کردار حقیقی ہیں۔ شہنشاہ اکبر کا جلال مغلیہ سلطنت کا غرہ و اوج، شہزادہ سلیم کی جمال پرستی، نور جہاں سے عشق و محبت، رقابت اور

شادی یہ سب باتیں تاریخی حقائق کی طرح موجود ہیں۔ نوجوان ولی عہد کی عاشقانہ طبعیت کے قصے تاریخ دانوں سے پوشیدہ نہیں رہے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت کے جلال کے ساتھ جب رومان کا جمال شامل ہتا ہے تو فن کا کمال نموپذیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

امتیاز علی تاج نے اس افسانے کو ادبی حقیقیت بنا کر تاریخ ادب کے ماتھے کا جھومر بنا دیا۔ تاج 1901ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 22 سال کی عمر میں یہ ڈرامہ تخلیق کیا۔ مگر اپنی حد درجہ ادبیت اور شعریت کے سبب اسے اسٹیج نہ کیا جا سکا۔ لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ اس ڈرامے میں رسمی تھیٹر کے تکنیکی و ڈرامائی عناصر کو مصنوعی طور پر ڈال کر اسے سٹیج کی زینت بنانے کا اہتمام کریں۔ مگر انہوں نے عوامی پسند کی خاطر اپنی تخلیق کے شاعرانہ حسن اور رومانی جمال کو مجروح کرنا گوارہ نہ کیا۔ وہ مغربی ڈرامے کی فنی بلندیوں سے آگاہ تھے۔ اسی لئے وہ اردو ڈرامے کو بھی اس مرتبہ وہ مقام تک پہنچانے کے لئے کوشاں تھے۔ وہ اپنے ڈراموں کے ذریعے ناظرین کے مذاق تمثیل کو بھی اعلیٰ وارفع بنانا چاہتے تھے۔

تھیٹر کے زوال کے بعد ڈراموں کا ایک دور شروع ہوا۔ جس میں بڑے بڑے ادیبوں نے سٹیج لوازمات سے صرف نظر کر کے تخلیقی حسن کے حامل ڈرامے سے لکھنے شروع کیے۔ ادبی رسائل و جرائد نے ان ادب پاروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور یوں یہ ڈرامے تصویر سے زیادہ تحریر' الفاظ اور اصوات کی

نفاستوں اور نزاکتوں کے شاہکار بننے لگے۔ امتیاز علی تاج کا ڈرامہ انار کلی اس سلسلے کی سب سے تابندہ مثال ہے۔ تاج نے یہ ڈرامہ لکھ کر اپنے اسلوب بیان اور زور قلم کا لوہا منوا لیا۔ انہوں نے لفظوں کے تاثر کو ڈرامہ بنا کر جذبات اور احساسات کی خوبصورت کہانی کو تخیل کے افق پر رقم کر دیا۔ انار کلی کے افسانوی کردار کے باوصف یہ ڈرامہ ایک تاریخی ڈرامہ ہے جس میں مغلیہ دور کے اس عہد کو بڑی خوبصورتی سے زندہ کیا گیا ہے۔ ڈرامہ پڑھتے یا سنتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اکبر اعظم کے محل میں داخل ہو گئے ہیں۔ جہاں ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہ کا جلال و جمال سانس لیتا' باتیں کرتا' محسوس ہوتا ہے۔ تاج کے سامنے سٹیج' تصویر اور حرکات و سکنات کے لوازمات نہ تھے انہوں نے سارا کام مکالموں سے لینا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مکالموں کے اعجاز سے کہانی کے تانے بانے کو بنا ہے۔ اس ڈرامے کو درحقیقت مکالموں کا ڈرامہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر مکالمہ کردار کی نفسیاتی کیفیت کے مطابق ہے اور ایک ایک کردار کو کئی کئی طرح کے مکالمے بولنے پڑتے ہیں۔ مگر امتیاز علی تاج کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر کردار کے ہر پہلو کو مکالموں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ اکبر اعظم ایک مطلق العنان بادشاہ بھی ہے ایک بیٹے کا باپ بھی ہے ایک شوہر بھی ہے۔ آقا بھی ہے اور سب سے بڑھ کر ایک انسان بھی ہے۔ چنانچہ ڈرامے میں جذبات کی دھوپ چھاؤں کے نقشے نمودار ہوتے ہیں۔ اکبر اعظم ہندوستان کے لئے تو بادشاہ ہے مگر اپنے بیٹے اور بیوی کے لئے تو بادشاہ نہیں۔

چنانچہ اس کے سامنے اس کی جذباتی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ تاج نے شہنشاہ کی انسانی بے بسی کی عکاسی اپنے مکالموں کے ذریعے بڑی خوبی سے کی ہے۔ ان کے مکالموں میں شاہی قلعہ دہلی کی ٹیکسالی زبان اور مروجہ روزمرہ محاورے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اکبر کے دور کی زبان ہرگز نہ تھی کیونکہ اس وقت اردو زبان نے جنم نہیں لیا تھا۔ مگر یہ تاج کا زور تخیل ہے کہ انہوں نے اپنے الفاظ کے ذریعے یہ باور کرایا کہ یہ مغلیہ عہد اور اس کے شاہی محلات اور ان میں بولی جانے والی زبان ہے۔ تاج کے ہاں کہیں کہیں لہجہ بھاری بھرکم اور دبنگ بھی ہو جاتا ہے۔ بعض فقروں میں پنجابی رنگ اور آہنگ بھی پیدا ہوا ہے۔ مگر سب کچھ ڈرامے کی ضرورت کے مطابق تھا۔ چونکہ یہ ڈرامہ شاہی تمکنت کی بہت اعلیٰ سطح کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے اس کے مکالمے ارفع اسلوب کے آئینہ دار ہیں۔ اس میں عامیانہ' بازاری اور سستا و سہل انداز بیان کار فرما نہیں ہے۔ اس میں مکالمے اکثر جگہ بہت طویل بھی ہو گئے ہیں جو کھلتے بھی ہیں۔ مگر چونکہ یہ ڈرامہ سٹیج کے لئے نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لئے گوارا نظر آتا ہے۔

یہ ڈرامہ سیاسی سماجی اصلاحی نہیں ہے یہ سیدھا سادا رومانی ڈرامہ ہے۔ جس میں حسن اور رومان کو شعری صداقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں رقص اور گانے بھی ہیں۔ فارسی نغمے بھی ہیں۔ موسیقی و ترنم کی پھوار بھی ہے۔ اس میں ہندی عناصر کے ساتھ ایرانی عناصر کی خوبصورتی سے پیوند کاری

کی گئی ہے۔ مگر ان سب چیزوں سے ہٹ کہ یہ ایک انسانی المیے کی کہانی بھی ہے۔ جس کے کردار انسان ہیں۔ شہزادہ سلیم ڈرامے کا ہیرو، انار کلی ہیروئن اور اکبر اعظم اور اس کی مغلیہ سلطنت ایک ولن کا رول ادا کرتے ہیں۔ باپ ظالم سماج بن کر دو محبتوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اپنے دولت و اقتدار کا سہارا لے کر محبت کو ناکام بنا دیتا ہے ۔ بیٹا بغاوت کرتا ہے۔ انار کلی جو ایک معصوم و مظلوم انسانی حیثیت دلا چارگی کی علامت و احتجاج ہے زندہ دیوار میں چن دی جاتی ہے۔ رسم و رواج اور قوت و اقتدار کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ محبت اور زندگی کی شکست کھا جاتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کی محبت کو اپنے خاندانی جاہ و جلال پر قربان کر دیتا ہے۔ انار کلی کو محبت نے امر کر دیا۔ سلیم حالات سے ہار مان لیتا ہے۔ اس میں انار کلی کو ایک مظلوم عورت اور سلیم کو ایک مجبور انسان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ بنیادی طور پر ایک ٹریجڈی ہے۔ اور اس میں ٹریجڈی کے سب مسلمہ عوامل و عناصر کو جمع کرنے کی کوشش کی گی ہے۔ اس کے علاوہ ڈرامے کے اصلی عناصر وحدت تاثر وحدت زمان وحدت مکان بھرپور طور پر موجود ہیں۔ اس میں کشمکش اور تحیر و تجسس کے عناصر بھی موجود ہیں۔ جذبات اور اعصاب کی جنگ بھی ہے محبت ہے۔ نغمے ہیں۔ رعب و دبدبہ ہے طوفان ہیں جدال و قتال ہے ان سب باتوں کے باوصف اس میں شعریت روح کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہ سارا ڈرامہ ایک خوبصورت غزل معلوم ہوتا ہے جو موسیقی کی سانسوں میں ڈھل کر قلوب پر

تاثیر برسا دیتا ہے۔ سید امتیاز علی تاج نے یہ ڈرامہ لکھ کر اردو ادب کے دامن کو وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ اور ادبی ڈرامہ لکھنے کی روایت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جیسا ادبی ڈرامہ آج تک نہیں لکھا جا سکا۔

جمیل یوسف کی غزل کے ساتھ اڑتالیس گھنٹے

ایک ایسے شخص کے بارے میں لکھنا جسے دیکھا نہ ہو۔ جسکے بارے میں لوگوں سے کچھ زیادہ سنا بھی ہو۔ جسکے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کیا ہو اور جس کے کلام کا ذکر بھی اڑتی سی خبر زبانی طیور کی مانند ہی کانوں میں پڑا ہو۔ مشکل ہے بھی اور ہونا بھی چاہئے۔ جمیل یوسف صاحب سے پہلا تعارف ان کی کتاب کے حوالے سے صرف دو روز پہلے ہوا ۔ مشتاق شباب صاحب نے ایک صبح ایک خوبصورت چمکدار رنگین کتاب لاکر دی اور ساتھ ہی حکم بھی سنایا کہ صرف دو دن میں اسے پڑھ ڈالئے اور پڑھ کر واپس کردیجئے۔ اور ستم بالائے ستم مزید کہا مضمون بھی تحریر کرڈالیئے۔ اب ایسے نادر شاہی فرمان پر توسٹی گم ہوجانے کا احتمال رہتاہے۔ مضمون مقالے کی بھلا کیا سوجھتی ہے چنانچہ ہم نے کتاب کو کھولا تو ایک خوبصورت آدمی کی خوبصورت تر رنگین تصویر نظر آئی۔ پہلی نظر نے کہا یہ آدمی اچھا ہوگا اور سچاہوگا۔ کچھ کچھ اپنائیت کا احساس ہوا۔ ہم نے صاحب کتاب کو پہلی نظر میں اور کتاب کو دوسری نظر میں پسند کرلیا۔ کتاب کا نام بھی پیارا لگا۔ ریا و تصنع سے پاک جہاں ہے اور جیسا ہے کہ بنیاد پر

اصلی تے خالص Generic نیم۔ ہماری پسندیدگی کی وجوہات میں اضافہ ہونے لگا۔ اب سوال یہ تھا کہ ایسے خوبصورت و رنگین آدمی کی شاعری کے ساتھ اڑتالیس گھنٹے کس طرح گزارے جائیں۔ یاد رہے مشتاق شباب صاحب نے اتنا ہی عرصہ ہمیں عطا کیا تھا۔ اگر اس میں سے سونے کا اوقات نکال دیے جائیں تو باقی 24 گھنٹے ہی بچیں گے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں سے کاروبار حیات ' نوکری چاکری اور سکوٹر بازی کے گھنٹے منہا کر دیے جائیں تو گھنٹے آدھے سے بھی کم رہ جاتے ہیں۔ اب ان دس بارہ گھنٹوں میں ہم نے کچھ تقاریب میں بھی شرکت مرفانا دوستوں سے ملنا ملانا اور بہت سے جھمیلے جھیلنا گویا کتاب اور ہمارا ساتھ گھنٹوں سے کم ہو کر منٹوں تک پہنچ گیا۔ اب کیا کیا جائے ہم نے اس کا علاج یہ دریافت کیا کہ ان گنے چنے لمحوں میں کتاب کو اپنے آپ سے جدا نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ' حتیٰ کہ کلاس روم میں پڑھاتے ہوئے بھی کتاب کو کھول کر سامنے رکھ لیا جائے۔ اور شعروں سے آنکھوں کو سیراب کیا جائے چنانچہ ہمارے ایک شاگرد نے ہماری اس حرکت کو استادانہ کمال جانا۔ ایک دوسرے نے ہمیں امتحان میں ڈالنے کے لئے ہم سے یہ کتاب ایک دن کے لئے طلب کر لی۔ ہم نے اپنی حرکت پر خفت محسوس کی اور کتاب بند کر کے بریف کیس میں رکھ لی۔ سٹاف روم میں آئے تو پھر مشتاق شباب کے خیال نے ستایا اور کتاب کھول لی۔ ایسے لمحوں میں واہ واہ اور ناقدانہ جائزے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ کوئی بتلائے کہ بتلائیں کیا والی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

ایسے میں ہمارے دوست نے جو ساتھ ہی بیٹھے تھے اخبار چھوڑ کر بے تکلفانہ کتاب ہمارے ہاتھ سے لے لی۔ کتاب کو دیکھ اور کھول کر چونکے ' فرمایا آپ نے تو پڑھ لی ہوگی۔ مجھے ایک دو دن کے لئے دے دیں۔ مگر ہمارے چہرے پر مشتاق شباب کا چہرہ دیکھ کر وہ ورق گردانی میں مصروف ہوگئے۔ کچھ لمحوں کے بعد فرمایا۔ آپ اتنی اچھی کتابیں پڑھتے ہیں ہمیں نہیں دیتے۔ دیکھیں کس قدر خوبصورت شعر کہے ہیں

سحر نہیں سحر کا مجھے فریب تو دو
شعاع روزن در کا مجھے فریب تو دو
نہیں بہار امید بہار کیا کم ہے
یہ ایک سایہ سر راہگزر کیا کم ہے

ہمیں خوشی ہوئی کہ چلو اشعار کا سلیکشن تو یہ حضرت ہمارے لئے کرنے لگے۔ ہم یہ کتاب ساتھ لئے شام کو ایک تقریری مقابلے میں بطور منصف بیٹھے۔ لڑکے بالے تقریریں فرما رہے ہیں اور ہم ہیں کہ غزلوں پہ غزلیں پڑھتے جا رہے ہیں۔ گھنٹیوں کی آوازیں ہمیں چونکاتیں مگر ہم اپنی پرانی مہارت و مشاقی کے طفیل اندازے سے نمبر لگاتے جاتے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہمارے صوفے پر بیٹھے ایک صاحب ذوق دوست نے وہ کتاب ہمارے ہاتھ سے لے کر ہمیں سٹیج کی طرف متوجہ کردیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک زوردار ہاتھ اپنے زانو پر لگا۔ موصوف بے اختیار واہ واہ کہہ رہے تھے اور اپنے حسن انتخاب کی

داد طلب کر رہے تھے۔ فرمایا دیکھو کتنا پیارا شعر ہے کتنی معنویت اور گہرائی ہے اسمیں

میں بھی ہوں گائنات میں تنہا   اے خدا تو ہی بے مثال نہیں

موصوف پوری غزل میں پڑھنے جا رہے تھے۔ مگر گھورتی ہوئی نگاہوں نے ان کو خاموش مطالعے پر مجبور کردیا۔

ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ اس مضمون کو کہاں سے شروع کریں۔ جمیل یوسف صاحب کے فن و شخصیت پر تبصرہ کیوں کر کریں۔ اتنی مختصر غائبانہ نیم ملاقات میں ہم ان کی غزل کے سحر سے ہی آزاد نہیں ہوپاتے۔ تو بات آگے کہاں بڑھائیں اگر محض اپنے تاثرات رقم کریں تو اس میں جانبداری اور پسند کا شائبہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ ہم اپنی پسندیدگی کی سند پہلے ہی ان کے ہاتھ میں تھما چکے ہیں۔ پھر سوچا اگر پسند نا پسند کا عمل دخل شروع ہوگیا۔ تو نقد و نظر، تنقید و تجزیہ کا حق کون ادا کرے گا۔ پھر خیال آیا کہ کیا نقد و نظر کے نام پر خوبصورت چیزوں کا آپریشن یا پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔ ایسا ضروری بھی نظر نہیں آیا۔ سو ہم اطف و لذت حاصل کرنے کے لئے جمیل یوسف صاحب کی غزل اور غزلیں بے تابانہ پڑھتے گئے۔ تنقید و تجزئے کی پابندیوں سے آزاد و بے نیاز ہوکر۔ اس نگاریں قصر صد رنگ کی سیر کرتے ہم پر احساسات جذبات اور فکر و نظر کے کتنے دریچے کھلتے گئے۔ ہر طرف سے خوشگوار ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے ہیں جو ہماری

بھی ہے۔ جس کی ضرورت سے ہم انکار بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر نے ان جذبوں کو زبان بخشنے کی سعی کی ہے جو ہمارے اندر بھی ایک تلاطم بپا کئے ہوئے ہیں۔ مگر شاعر کا وجدان ان کو پیمانہ جمال میں اس طرح گرفتار کرتا ہے کہ شعر کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر اپنی خوبیء سخن پہ نازاں بھی ہے۔ وہ طمانیت سے یہ دعا بھی مانگ اٹھتا ہے۔

بخش دے دوسروں کو دیر کی ساری دولت
مجھ کو بس شعر کی عظمت کا خزینہ لکھ دے

شاعر حسن کا پرستار ہے۔ حسن ہی اس کے لئے حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ اس کو ہر منظر ہر مکاں ' ہر بات ' ہر بیان ' ہر بدن میں اس حسن کے جلوے طور فگن نظر آتے ہیں۔ جمیل یوسف کی شاعری جمیل بھی ہے اور یوسف طور بھی۔ ان کا شعر سراپا غزل ہے۔ جس کی کلید حسن لازوال کی پوجا و پرستش ہے۔

اور سارے بیان جھوٹے ہیں
حسن ہی نام ہے حقیقت کا
ہر منظر جوان ہے عبادت مرے لئے
ہر حسن بے حجاب کو سجدہ کروں ہوں میں
ہم نے اس وقت دھنک کو دیکھا

جب فضا میں تیرے بازو چمکے
جب جام اٹھاوں ترا قامت نظر آئے
جب بات کرے مستی صہبا تجھے دیکھوں
زلف کے بادل، بدن کی روشنی آنکھوں کی شام
اس زمین پر آسماں پھیلا ہے میرے سامنے

یہ اس کی حسن پرستی ہی ہے جو اس سے سارے جہاں کی قیمت پر چہرۂ یار کی طلبگار ہوتی ہے

اور جو کچھ ہے زمانے میں رہتا نہ رہتا
سامنے ایک چہرہ زیبا رہتا

شاعر حسن کی تلاش میں ساری سختیاں سہتا ہے تلخیوں کے گھونٹ پیتا ہے مگر اپنی خودی اور خودداری کا سودا نہیں کرتا

ہے درپے آزار سارا جہاں اور ایک میں
یہ دوریاں، یہ سختیاں، یہ تلخیاں اور ایک میں

مگر اس حالت میں بھی وہ سائے کا طلبگار نہیں ہوتا

دھوپ کے دشت بلاخیز میں جلتے رہے
کسی سائے کے طلبگار نہ ہونے پائے

غزل کے شاعر کا شعور عصری جبر کے ہاتھوں زخمی ضرور ہے۔ مگر اس میں نظریاتی نفرتوں کے الاؤ نہیں دہکتے البتہ اس معصوم و بے خطا انسان کی بے بسی

کی کسک ضرور گریہ کناں نظر آتی ہے جو اپنی خوشیاں خریدنے کے لئے کاسہ سر کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے بھی تیار ہے

اب لے کے اپنا کاسہ سر جانا چاہئے
اس کی گلی میں باردگر جانا چاہئے

شاعرِ غزل حسن کے معبدوں میں عقیدت کے دئے جلانے کو ہی حاصل زندگی نہیں سمجھتا۔ بلکہ زمین اور زمانے کے قرض کے طور پر اندھیروں کا سینہ چاک کرنے کا تمنائی بھی ہے۔ وہ ظلمت کا فسوں توڑنے والی تازہ کرن کا منتظر بھی ہے۔ وہ کالی رات کے سیاہ بھیڑیوں کی موت کا طلبگار بھی ہے۔ وہ قاتل شہر کو دیکھ رہاہے۔ مگر اسے یہ بھی خیال ہے کہ قاتل کو ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ خود بھی اس معاملے میں بے بس ہے۔ اسلئے وہ سرابوں کے جنگل میں موج رواں کے ابھرنے کا منتظر ہے۔ وہ بے خبر غزل گو نہیں بلکہ اپنی صدی کا شعور مند بیٹا ہے۔ جو ماں پر ہونے والے مظالم سے آگاہ ہے۔ وہ جانتاہے کہ اس کے راہبر ہی اس کے راہزن بن چکے ہیں

ہمیں ہی شوق تھا ہر راستے میں لٹنے کا
جو راہزن تھے وہ سب راہبر ہمارے ہوئے
ہرکس و ناکس کو اپنا رہنما کیسے کروں
ناخدا بھی جو نہیں اس کو خدا کیسے کروں
ہرچند اس کے وار سے کوئی بچانہ تھا

قاتل کو شہر بھر میں کوئی ٹوکتا نہ تھا
ان سرابوں سے کوئی موج رواں بھی ابھرے
خشک صحرا کے ورق پر کوئی دریا لکھ دے
سحر کب روشنی لائے گی کتنی رات باقی ہے
وہ ساعت کس گھڑی آئے گی کتنی رات باقی ہے
کوئی تازہ کرن پھوٹے کہ ظلمت کا فسوں ٹوٹے
وہ کالی رات کب جائے گی کتنی رات باقی ہے

اس تناظر میں شاعر کا دردمند شعور کرب کے چر کے سہتے سہتے زندگی کی حقیقت پر یوں تبصرہ کرتا ہے

اک دعویٰ سونے چاندی کا اک جھگڑا دانے پانی کا
سوچو بس عنوان دنیا کی رام کہانی کا

وہ اس حد تک برا فروختہ ہو جاتا ہے۔ کہ اس منہ سے یہ بات تک نکل جاتی ہے

اک مسلسل فریب فکر و عمل
دانش و علم و آگہی کیا ہے

اس کی مایوسی نے نئی نوید کے سارے ممکنات کو گل کر دیا۔ یہ شعر ان کے شعور تاریخی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے

ایک نئی نوید کے جتنے بھی ممکنات تھے۔

وہ بھی اسیر پنجہ ماضی و حال ہوگئے

جو شاعر پنجہ ماضی و حال ' اس کے ممکنات اور نئی نوید کے تصور سے آگاہ ہو۔ اسے محض حسن پرست شاعر کہہ کر رومانیت کی خوش رنگ گلیوں میں نہیں دھکیلا جاسکتا۔

شاعر غزل نے اپنا آئیڈیل غزل کے تاج محل غالب کو قرار دیا ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے اس انٹرویو میں بھی کیا ہے۔ جو کتاب میں دیباچے کے طور پر شامل ہے۔ غالب سے محبت و عقیدت کی اثر آفرینی کے تحت انہوں نے غالب کی زمین میں بے شمار غزلیں تخلیق کی ہیں۔ جو فکری رفعت کے طور پر نہ سہی۔ صوری آھنگ کی صورت میں غالب کی دور سے آتی یاد کو تازہ کردیتی ہے

بے وفائی تو نہ تھا میری محبت کا صلہ
اس کو اس بات کا احساس ہوا میرے بعد
زندہ تھا اگر میں تھا ترے حسن کے دم سے
اے کاش جو سامنے رہتا کوئی دن اور
زندگی رقص میں ہے عرض ہنر ہونے تک
میں ہوں سرگرم سفر گرد سفر ہونے تک
اس ہجوم رنگ میں دل کا سکوں پائیں گے

روشنی سے خواہشوں کے زخم بھر جائیں گے

میں اسے چاہوں بھلا کب مجھ میں اتنا حوصلہ

میں اسے دیکھوں بھلا کب سے دیکھا جائے ہے

تیرے فراق میں اے دوست اب یہ حالت ہے

کبھی صبا کو کبھی نامہ برکو دیکھتے ہیں

یوں نہ مجھ سے ملا کرے کوئی

اب نہ آئے خدا کرے کوئی

جمیل یوسف صاحب کا تغزل ہی پاکیزہ پر کیف نہیں ان کے افکار میں بھی حسن و خیر کی منفرد چاشنی ملتی ہے۔ جس کا اظہار ان کے کلام موجود ہے۔ ان کے اندر شعرو ادب کی اصلیت و اکملیت کے باب میں ایسے نکات موجود ہیں۔ جو بحث کے دروازے کھولتے ہیں۔ خاص طور پر شکیسپئیر ٗغالب ٗ علامہ مشرقی ٗ مذہبی ادب ٗ نظریئہ پاکستان ٗ روٹی کے موضوع پر ان کے خیالات کے اختلافات کی کافی گنجائش موجود ہے۔ مگر ہم اس مختصر تحریر میں ان مباحث میں نہیں الجھتے۔ ان کی غزل بے داغ ہے۔ جو بد صورتیوں کو ڈھاکر اک کلیسائے حسن و خیر تعمیر کرتی ہے ۔ جسے پڑھ کر شعرو سخن کا اعتبار بڑھتا ہے۔ اور آدمی دل کی راہ سے جمیل یوسف کے ذہن کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس کتاب اور صاحب کتاب کے شاعرانہ محاسن و کمالات پر بحث کرنے کی یہاں اس مختصروقت میں گنجائش نہیں۔ کتاب سے لطف اٹھانے کی منزل ابھی ختم نہیں ہوئی۔

مصنوعی لطف جب کثرت استعمال سے پھیکا پڑتا ہے۔ اس وقت انسان تنقید و تجزیئے کا ترازو اٹھاتا ہے۔ انصاف چونکہ محبت کی عاجزی کا نام ہے۔ اس لئے ہم محبت کو عاجز نہیں کرنا چاہتے۔ اور یہ ترازو نقادان فن کے لئے چھوڑتے ہیں۔ اور لطف محبت حسن و خوبی کی پھواروں سے دامن کو بھرتے ہیں۔ کہ یہ دولت لازوال ہے۔ ہم اسی طلسم حسن میں گرفتار تھے کہ مشتاق شباب کے اڑتالیس گھنٹے گزر گئے۔ کتاب واپس چلی گئی مگر ہم کو معلوم ہوا کہ کتاب اور صاحب کتاب مدتوں سے ہمارے دوست تھے۔ اور مدتوں ہمارے قلب و ذھن میں بستے رہیں گے۔

مجبور خٹک اور سلگتے پھول

ڈاکٹر ظہور اعوان

مجبور خٹک شعر کہنے پر مجبور ہے اسکے اندر شاعری تو ہے ہی۔ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے اور یہ چیز کو مٹ منٹ کہلاتی ہے۔ مجبور خٹک لفظوں کا شاعر نہیں کو مٹ منٹ کا شاعر ہے۔ وہ شاعری کو ہتھیار تلوار اور پرچم کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ اول و آخر ترقی پسند ہے مگر اسطرح کا ترقی پسند نہیں جو پارٹی لائن کا اندھا مقلد بن کر رات کو دن اوردن کو رات بنانے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ اسکی پارٹی لائن اس کے اندر سے پھوٹی ہے اور مجبور نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسی لائن کو اپنی پوری زندگی میں اپنائے رکھا ہے۔ مجبور خٹک سماجی ناانصافیوں معاشرتی ناہمواریوں اور سیاسی اجارہ داریوں کو اپنے چاروں طرف جال پھیلائے دیکھتا ہے۔ انسان کے ہاتھوں انساں کے بد ترین استحصال کو دیکھتے ہوئے۔ اس کا دل خوں کے آنسو روتا ہے اور پھر جذبے لفظوں میں اور لفظ شعروں میں ڈھل کر ڈھلک پڑتے ہیں۔ مجبور خٹک کی شاعری میں انقلابی روح جاری وساری ہے۔ وقت نے ان کو جو گھاؤ دئے ہیں انہوں نے اس کی شاعری میں ایک معنویت پیدا کردی ہے

شاید تجھے بھی وقت نے کچھ زخم دے دئے
مجبور تیرے ہاں تو یہ گہرائیاں نہ تھیں

مجبور خٹک اس غریب سرزمیں کا غیرت مند بیٹا ہے جس کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں ہر طرف دکھ ہی دکھ اور فریب ہی فریب دکھائی دیئے ہیں۔ زندگی ان کی راہوں میں پھول کھلانے کی جگہ ناکامیوں کے کانٹے کاشت کرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر لاچارگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے خان نواب رئیس صاحبان اقتدار غریب انسانوں کی زندگیوں کے گرد گھیرا تنگ کئے ہوئے ہیں۔ مجبور ان فرسودہ جکڑبندیوں کو نہیں مانتا وہ علم بغاوت بلند کرتا ہے اسکے پاس کوئی ہتھیار نہیں سوائے غیرت غصے اور

نفرت کے ہتھیاروں کے وہ انہی سے کشتی کے پتوار بناتا ہے اور مشکلات و نامرادیوں کے سمندر میں اپنی کاغذ کی ناوء لے کے چل پڑتا ہے

مجبور عمر بھر رہا ناکامیوں کا ساتھ
وارفتگیء شوق مگر کم نہ ہو سکی

مجبور کی وارفتگی شوق کو ناکامیوں نے مہمیز دی۔ جتنی مشکلات بڑھتی گیئں اتنی اس کی کومٹ منٹ بڑھتی گئی انکار بڑھتا گیا اس نے حالات کے مقابلے میں ہار نہ ماننے کی قسم کھالی تھی وہ اکثر جگہ (نہلزم) کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ ان کے فکر وخیال پر کلبیت (cynicism) کی چھاپ بھی نظر آنے لگتی ہے مگر وہ مروت و محبت کے نام پر استحصالی قوتوں سے سمجھوتہ کرنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں وہ ٹھکرائے ہوئے لوگوں اور جذبوں کا پرستار ہے اسکی محفل میں یہی ٹھکرائے ہوئے لوگ بار پاتے ہیں۔

سکوں ملتا ہے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو اسکے ہاں
جہاں والے جسے بس رونق محفل سمجھتے ہیں

وہ دل پرخون کی اک گلابی سی عمر بھر شرابی بنا رہتا ہے اسکا شعر اس کے اپنے لہو سے رنگین ہوا ہے اسکی شاعری اسکی اپنی ہی شکست کا شاخسانہ ہے

رنگین لہو سے ترا ہر شعر ہے مجبور
ان کو میں تیرے دل کی صدا کیوں نہ کہوں گا

غزل کے سانچے میں انقلابی صداؤں کو سمونے کے لئے شعر کو کھٹنائیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات شعریت زائل ہو جاتی ہے مجبور کے ہاں بھی جذبہ اتنا منہ زور ہو جاتا ہے کہ وہ نزاکتوں نفاستوں کو روندتا منزل خیال کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ مجبور کو اسکی پرواہ بھی نہیں وہ اپنی بات کہنا چاھتا ہے براہ راست کہنا چاھتا ہے اگر مشاہدہ حق کی گفتگو اور بادۂ وساغر کا وسیلہ کام میں لایا جاسکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اصل مقصد تو دریدہ بدنی کی گہرائیوں کی نمائش کرنا ہے۔ لفظ و شعر مجروح ہوں تو ہوں

زخم اور جذبے مجروح نہ ہوں مجبور کی شاعری اسی دھوپ چھاؤں میں سے گزرتی ہے

آوارگیء فکر سردار لے گئی
منبر سے ورنہ کوئی عداوت نہ تھی ہمیں

یہ کس مقام پر ہم آکے ٹھہرے ہیں
ہر ایک سانس پہ افسردگی کے پہرے ہیں

پھیل جاتے ہیں اندھیرے بھی اجالے بن کر
روشنی جب پس زنداں ہوا کرتی ہے

مجبور خٹک کی شاعری میں رومانوی رنگ کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں اور وہ ان رومانوں کے تعاقب میں اپنے ماضی کے دریچوں کو کھول کر میٹھی مستانی ہواؤں سے مشام جاں معطر کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی اس مدھر بستی میں پیار محبت کا راج ہے۔ ہر طرف سوندھی سوندھی خوشبوئیں ہیں۔ پیار کے جگنو ہر آنگن میں روشن مسکانیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ ہر طرف مستی اور سرمستی چھائی نظر آتی ہے

دور پہاڑوں کے دامن میں دل والوں کی اک بستی تھی
جس کے باسی پھولوں جیسے پھولوں پر چھائی مستی تھی
گھر اپنے تھے پیارے پیارے سوندھی سوندھی خوشبو والے
پیار کے جگنو ہر آنگن میں پر پھلائے ڈیرہ ڈالے
رنگوں کی دنیا میں رہتے پیار کے گلشن میں مسکاتے
کانٹوں سے بچ بچ چلتے پھولوں سے دل کو بہلاتے

اس دل فریب عالم میں شاعر کی ملاقات اپنی محبوبہ سے ہوتی ہے اور دونوں

ایک ہی نظر میں گھائل ہو کر ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ بس ایک دوسرے کی آنکھوں میں کھوئے رہنا روٹھنا منا چپ ہو جانا اور ایک گداز اداسی اور دلفریب سناٹا چاروں طرف سایہ فگن تھا

خواب سا جیسے ہم نے دیکھا پل بھر میں پہچان ہوئی تھی
سانسیں اپنی ایک ہوئی تھیں ایک ہماری جان ہوئی تھی
اک دوجے کو تکتے رہنا آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہنا
نظروں کا شعلہ بن جانا تیر نظر کا دل پر سہنا
روٹھے تو بے چیں سا ہونا اور چپکے سے خود من جانا
وقت ہمارے گرد بنتا تھا ایک عجیب سا تانا بانا
ہم نے سمجھا دیپ جلیں گے چاروں اور اجالا ہوگا
اپنے جیسا اس بستی کا ہر باسی دل والا ہوگا

مگر یہ سب خواب ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئے بکھر گئے ہر طرف بیری لوگ بیر کمانے آگئے۔ ظالم سماج نے معصوم خوشیوں کو تاراج کرنے کی قسم کھالی تھی۔ پھولوں پر اوس اور شعلوں پر پانی پڑ گیا تھا۔ عشق محبت معصومیت کا قتل عام ہو گیا۔ مجبور کی خوشیوں کا تاج محل چکنا چور ہو گیا۔ اسکے خواب ویران ہو گئے وہ جس دنیا کو امن دوستی اور وفاء کا گہوارہ سمجھتا تھا وہ جفاؤں کے بان لے کر اسکی دنیا ویران کرنے آ پہنچے۔ مجبور کا مظلوم انسان سربازار قتل ہو گیا اور اسکے ارمانوں کے پھول مہکنے کی جگہ سلگنے لگے۔ یہ ان کی فکری دنیا کا واٹرشیڈ تھا

جانے کیوں سب لوگ ہمارے پیار کے دشمن بن بیٹھے تھے
اپنوں نے بھی بیر کمایا بیگانے تو بیگانے تھے

خواب سے جب بیدار ہوئے ہم ہر سو خوف کا سناٹا تھا
اپنا جیون لاشہ ہم نے اپنے کاندھوں پر رکھا تھا
دور ہوا کیوں جانے ہم سے جس کو تھا ہم نے اپنایا
پیار کو ہم نے اس دنیا میں بے بس و مجبور ہی پایا

مجبور کی رومانی دنیا ویران ہوئی محبت کے مرقد پر خوشیوں کی جگہ ارمانوں کی پھول سلگنے لگے تو پھر وہ انقلاب کی راہوں کی طرف چل نکلا وہ دنیا سے اپنی دفاؤں اور معصومیتوں کے قتل کا بدلہ لیتا نظر آتا ہے اور ہر اس چیز کو توڑنا چاہتا ہے جو غریب نادار اور لاچار انسانوں کی زندگی میں زخم کاشت کرتی ہے

دیئے سرخ مشرق کے پر نور ہیں ہم
ہوا کیا اگر اتنے مجبور ہیں ہم
شراب بے خودی پی کے مخمور ہیں ہم
خود آئے گی منزل اگر دور ہیں ہم

مجبور خنک زندگی بھر مجبوریوں سے نبرد آزما رہے۔ ذاتی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی اپنی ذات کی ارد گرد جو فیوڈل سلاخیں تھیں ان کو توڑ کر آزاد فضاؤں میں پہنچا تو وہاں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو غربت افلاس جہالت بیماری کی زنجیروں میں جکڑا پایا۔ ملکی سیاست پر مارشل لاؤں کے کیکڑے قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ اقتصادیات پر تاجروں کی حکمرانی تھی۔ انسان انسان کو لوٹ رہا تھا مجبور نے ان حالات کو دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کیں۔ بلکہ وہ علم بغاوت لے کر میدان عمل میں کود پڑا اور اپنا علم اور اپنی تمام صلاحیتیں ترقی پسند سوچوں اور قوتوں کے نام کردیں۔ اس نے اپنے ٹیلنٹ

کو جلا دینے کی طرف توجہ نہیں کی۔ نہ فنکارانہ اور فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھا۔ یہ پیٹ بھروں یا صوفہ نشین دانشوروں کا کام ہے۔ وہ مزدور تھا قلم اسکا پھاوڑہ تھا اس کو لے کر میدان میں کود گیا۔ وہ پکی زمین کھود کر فرہاد نہیں بننا چاھتا۔ وہ پتھروں میں سے چنگاریاں اگا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتا ایک محنت کش کہتا ہے۔ ایک ایسا محنت کش جو ان لوگوں کا رونا رو رہا ہے جن کے پاس رونے کے لیے بھی وقت نہیں ہے سلگتے پھول اسکی قلمی جد وجہد کی ایک ادنی سی سعی ہے

مجبور خٹک کا اصل نام فضل دین ہے۔ پیشے کے لحظ سے وہ ڈاکٹر ہیں وہ ۱۹۳۶ میں کوہاٹ کے گاؤں ٹیری میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام رکن الدین تھا۔ انہوں نے آنکھ کھولی تو ارد گرد ایک جاگیر دارانہ ماحول پایا مجبور خٹک کے ذھن و مزاج نے ان جکڑ بندیوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ موقع ملتے ہی وہ اس گھٹن زدہ ماحول سے نکلے سب سے پہلے انہوں نے اپنے آپ کو ان زہر ناک اثرات سے ماموں کرنا تھا۔ انکے پاس دولت تو نہ تھی اس لئے انہوں نے علم کی دولت حاصل کرنی شروع کردی۔ تعلیم کے سلسلے میں لاہور اور فیصل آباد میں مقیم رہے اپنے شعبے میں اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ملازمت کے سلسلے میں صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے اور شعری وادبی سرچشموں سے فیض حاصل کرتے رہے اس دوران وہ اپنے ہتھیاروں کو تیز کرتے رہے۔ کوہاٹ میں بسلسلہ ملازمت صرف دو سال قیام کیا۔ باقی عرصہ باہر ہی رہے کوہاٹ کے قیام کے دوران پشتو کے معروف شاعر ایوب صابر سے ربط ضبط بڑھا۔ ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہوئے مگر انہوں نے کسی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ ایوب صابر سے صرف دوستی تھی اور مشترکہ طور پر علمی ادبی محفلوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ باقاعدہ اصلاح انہوں نے پشتو کے باب میں کسی سے حاصل نہیں کی البتہ اردو کی اصلاح کے لئے شوکت واسطی سے رجوع کرتے رہے۔ مجبور نے کبھی زبان وبیاں کی اصلاح کو اپنا مسئلہ نہیں بنایا۔

سوچ ان کی اپنی ہے۔ ذریعہ اظہار ان کا اپنا ہے۔ انہوں نے کسی موقع پر اپنے مقصد اور مشن کو زک نہیں پہنچنے دی۔ مجبور ایک بھرپور اور مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ علمی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے اپنے دل کی باتیں سنا آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو کسی ایک دراور گھر کا پابند نہیں کیا جس نے بلایا چلے گئے ان کا کہنا ہے کہ ہمارا کام صدا لگانا ہے۔ مندر والے بلا لیں یا مسجد والے انکار ہم نے نہیں کرنا۔ مجبور خٹک کو استعمار اور آمرتیوں سے سخت بیر ہے۔ جب بھی وطن عزیز پر آمریت نے اپنے سائے پھیلائے۔ مجبور خٹک ایک غیرت مند راجپوت کی طرح تلوار سونت کر میدان میں نکل آئے اور اپنے لفظوں اور شعروں کو آگ بناکر دشمنان وطن کے قلعوں پر برسانے لگے۔ وہ سیاسی طور پر ایک بیدار مغز انسان ہیں اور مزدوروں کسانوں اور دوسرے کچلے مسلے طبقوں کی محرومیوں کو اپنے فکر وخیال میں نمایاں طور پر پیش کرتے رہتے ہیں۔

مجبور خٹک اردو کے ساتھ پشتو میں بھی شعر کہتے ہیں۔ بلکہ بقول شخصے پشتو ہی کے شاعر ہیں۔ پشتو چونکہ ان کی مادری زبان ہے۔ اس لئے اس میدان میں ان کا اشہب شوق بلندیوں پر اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ پشتو کے سرکردہ ترقی پسند دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں ان کا کلام پشتو دنیا میں وقت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر مجبور خٹک کسی لسانی عصبیت کا شکار نہیں۔ ان کی یہ ادا ان کو ایک جینئن ترقی پسند بناتی ہے وہ زبانوں کو خدا بنا کر اس کی پوجا نہیں کرتے اور نہ وہ اس قوم پرستی کے قائل ہیں جو انسانوں کی زندگیوں میں زہر بھر کر انسان کو انسان کا دشمن بنا دیتی ہے۔ وہ انسانوں کو صرف دو طبقوں میں تقسیم ہوتا دیکھتے ہیں یعنی لوٹنے والے اور لٹنے والے۔ مجبور خٹک چونکہ لٹا بھی ہے اور لٹا بھی جا رہا ہے۔ اس لئے اسکا فطری سانجھ مجبوروں محروموں اور مستضعف انسانیت کے ساتھ ہے۔ اس کے لئے ساری دنیا میں انسانوں کے ہی دو طبقے ہیں گورے کالے افریقی امریکی ایرانی تورانی عربی عجمی انگریزی فرانسیسی کی باقی

قسمیں اس بورژوا طبقے کی بنائی ہوئی ہیں۔ جو غریبوں کو لوٹنے کے بعد ان کو مختلف جغرافیائی مذہبی اور قومی فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑا دیتا ہے تاکہ اس کے گھناؤنے کرتوتوں پر پردہ پڑا رہے۔ مجبور خٹک سرمایہ دار کی اس چال کو سمجھتا ہے۔ وہ اردو انگریزی اور پشتو بولنے والے لیٹرے اور وڈیرے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ وہ کسی کو پشتو کی آڑ میں پناہ لینے کے انعام کے طور پر معاف نہیں کرتا۔ مجبور کا مذہب ومسلک انسانیت ہے۔ زبان اس کے لئے اظہار کا ذریعہ ہے۔ وجہ افتخار نہیں زبانیں انسانوں کے ملانے' ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے اور دنیا سے ظلم وانصافی کے خاتمے کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے کام میں لائی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجبور نے ہر زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ پاکستان کے سب مظلوم انسانوں کے دکھوں کا مداوا چاھتا ہے اس لئے اس نے پاکستان کے لنگوافرینکا اردو کوذریعہ اظہار بنا کر اپنا پیغام خرلاچی سے کراچی تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ متعصب لکھنے والوں کی بھیڑمیں مجبور ایک بین الاقوامی انسان ہے۔ مجبور کی شاعری میں پوری انسانیت کا دکھ درد ٹیس مارتا دکھائی دیتاہے۔ وہ زندگی انسان اور اس کائنات کو خانوں میں بانٹنے میں یقین رکھتا۔ اور چھوٹے ذھنوں والے آبا اور زباں پرستوں نے جو خانے بنا بھی رکھے ہیں ان کو بھی توڑ کر ایک ملت انسانیہ کی بیکراں وسعتوں میں پھیل جانے کی تبلیغ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبانیں نکالے ہوئے زبان پرست ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے وہ اس کو برھمن بنانا چاھتے ہیں مگر وہ ان اربوں لوگوں کا ساتھ دینے کو زندگی کا قرینہ مانتا ہے جنہیں اچھوت اور شودر کہا جاتا ہے۔ یہی مجبور کی بڑائی کی دلیل ہے

مجبور خٹک ہمارے دوست ہیں۔ مدت مدید سے شعروشاعری کے شغل میں مصروف ہیں۔ اپنا کلام لکھ لکھ کر اگر گھڑے میں نہیں ڈالتے رہے تو کسی پرانے فریج میں ضرور رکھتے ہوں گے۔ اب دوستوں کی دیکھا دیکھی یا ان کے اصرار پر ان کے اس کلام کے چھپوانے کے خیال آیا ہے۔ ہم نے لاکھ ان کو سمجھایا کہ بھائی اس چکر میں نہ پڑو۔ بس

وقت گزارو۔ یہاں کتاب لکھنا اگر گناہ صغیرہ ہے تو کتاب چھپوانا گناہ کبیرہ ہے۔ اول تو سارے ملک میں گھوم جائیں۔ کوئی چھاپنے والا نہیں ملے گا۔ قرض مام لے کر یا کسی ادارے کی منت سماجت کروا کے کتاب چھپوا لو تو خریدنے والا نہیں ملے گا۔ مفت بانٹو' ڈاک کا خرچہ جو اب کتاب کی قیمت سے بڑھ گیا ہے۔ وہ برداشت کرو۔ پھر تعریفی لوگوں کا انتظار کرو۔ تبصرہ نگاروں کو چائے پلاؤ۔ ان کو خوشامد کرو۔ طوطا" کرہا" وہ تبصرہ لکھ کر بھیجیں۔ تو اخبار والے چھاپیں گے نہیں۔ جس جس کو کتاب دی اس کے چہرے کو جھانکیں۔ کہ اب وہ منہ سے پھوٹ کر آپ کی کتاب کا ذکر کرتا ہے۔ آپ گھیر گھار کر اسے اس موضوع کی طرف لے آئیں۔ تو کہے گا کتاب تو اچھی ہے۔ مگر کتابت کی غلطیاں بہت ہیں ساری باتیں کر جائے گا۔ لکھنے والے کی محنت کی داد نہ دے گا مگر مجبور خٹک نے ہماری ایک نہیں سنی۔ اور کتاب چھپوانے چل پڑے ہیں۔ ان کی کتاب کا حشر ہم کو معلوم ہے۔ مگر خود کردہ را علاج نیست۔ وہ کریں اور بھگتیں ہم تماشہ کریں گے۔ گھر پھونک تماشہ دیکھ کر کتاب چھپوانا اسی عمل کے نام ہے۔

مجبور خٹک پیشے کے اعتبار سے وٹرنری ڈاکٹر ہیں۔ دن بھر دفتر میں حیوانی امور پر غور کرتے ہیں۔ شام کو گھر آکر انسانی جذبات و احساسات کے آبگینوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ پشتو کے شاعر ہیں۔ مگر اردو میں بھی شعر کہہ رہے ہیں۔ قلم بہ کف اور شمشیر بدست رہتے ہیں۔ در اصل وہ شاعری کرتے ہیں اس لئے ہیں کہ مجبوروں ظالموں اور دکھیارے لوگوں کا ساتھ دے سکیں۔ اس لحاظ سے وہ لفظوں یا زبانوں کے شاعر نہیں۔ فکر و خیال کے شاعر ہیں۔ اپنی سوچ اور نظریے کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کہ ان تک کامیاب ہوئے یہں۔ یہ تو ان کی کتاب پڑھ کر ہی معلوم ہو گا۔ ان کا مجموعہ سلگتے پھول کے نام سے سامنے آرہا ہے۔ اس کا چھپنا بھی مشروط ہے کسی صاحب دل شخص یا ادارے کی جیب کے ساتھ۔ شاعروں کے دل اور دماغ تو بھرے ہوتے ہیں۔ مگر جیبیں خالی ہوتی ہیں۔ مجبور خٹک بھی ہماری طرح دولت کی جگہ کاغذ ہی سنبھالتے رہے ہیں۔

مجبور خٹک میٹھے مسکراتے پیارے سے انسان ہیں۔ بہت مہذب اور شائستہ۔ باتوں میں اپنائیت اور خلوص ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کے لوگوں میں بیٹھتے ہیں۔ عضب کے پھنکارتے بلوں کے آس پاس رہتے ہیں۔ مگر کسی منفی اور چھوٹی سوچ کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ وہ زبان کے پجاری نہیں' فکر و خیال کے پرستار ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں دو ہی طبقے ہیں۔ لوٹنے اور لٹنے والوں کا۔ باقی کی تفریقات کی بوژوا طبقے نے لٹنے اولے طبقے میں پھوٹ ڈالنے کے لئے بنائی ہیں۔ نسل و طبیت رنگ' زبان کلیسا یہ سب خواجگی کی تعمیر کردہ مسکرات ہیں۔ مجبور خٹک س حقیقت سے آگہی رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ آفاقی سوچ رکھتے ہیں۔ مجبور خٹک بھاری بھرکم جسم کے مالک رجائیت پسند انسان ہیں۔ ان کے وجود سے محبت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ وہ غصے نفرت سے اپنے خارجی اور داخلی دونوں وجودں کو پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجبور خٹک دوستوں کے دوست تو ہیں۔ وہ دشمنوں کے بھی دوست ہیں۔ اس لئے ان کا کوئی دشمن ہے ہی نہیں۔ مجبور خٹک نے کبھی اپنے آپ کو لسانی تعصب کی جکڑ بندیوں میں مقید نہیں کیا۔ نہ کسی نسلی کج ادائی کا شکار ہوئے۔ وہ سب انسانوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ سب سے پیار کرتے ہیں۔ مجبور خٹک نے ساری زندگی متکبر طبقوں سے لڑتے جھگڑتے گزاری ہے۔ اس ایک باب میں ان کی شخصی اور فکری دونوں لحاظ سے کوئی لچک نہیں ہے۔ اس لئے وہ خود متکبر اور مستکبر بنا گوارا نہیں کرتے۔ مجبور خٹک اتنی اچھی اردو بولتے ہیں کہ آدمی سنتا جائے اور خود سر دھنتا جائے۔ ہمارے پاس جب وہ آکر بیٹھتے ہیں تو محبت و مروت کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ وہ ایسے انسان ہیں۔ جن کی محبت انسان کو حرارت بخشتی ہے۔ زندگی پر اعتبار بڑھاتی ہے۔ اور یہ دنیا رہنے کی جلہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ انسان ایک دوسرے سے بے غرضانہ طور پر صرف اس لئے پیار کرلیں کہ وہ انسان ہیں تو ہر طرف سکون کھل کھلا اٹھے گا۔ غربت کے دکھ قابل برداشت ہو جائیں گے۔ اور زمانے کے آلام کے دیئے ہوئے زخموں پر مرہم رکھا جائے گا۔ مجبور کا مشن بھی یہی

ہے۔ پیار ہی ان کا علم ہے۔ پیار ہی ان کی زبان ہے۔ پیار ہی ان کا ایمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست ان سے پیار کرتے ہیں۔ ان کی کتاب کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اور اس کے چھپنے سے پہلے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ مجبور خٹک کے سلگتے پھولوں میں نفرت کی سلگاہٹ نہیں۔ لطف و کرم کی مہکاوٹ ہے۔ اس لیے کہ خوشبو کا کوئی وطن اور ڈومسائل نہیں ہوتا۔ مجبور کی شاعری بھی بغیر ڈومسائل کی شاعری ہے۔

سیدہ حنا

سیدہ حنا کے افسانوں کا مطالعہ جب دور جدید کی نام نہاد ادبی بدعتوں کے تناظر میں کیاجاتا ہے۔ تو کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کسی نے پوچھا بڑا فن کیا ہوتا ہے۔ جواب ملا جو سمجھ میں آجائے۔ آج تک کی معلوم تاریخ میں بڑے فن کے لئے اور معیاروں کے علاوہ یہی ایک بڑا معیار ٹھہرتا ہے۔ اگر آج ہومر ' ورجل ' دانتے گوئٹے 'ملٹن 'شیکسپئر 'رومی ' فردوسی ' غالب و اقبال بڑے سمجھے جارہے ہیں۔ اور پڑھے جارہے ہیں۔ تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سمجھے جارہے ہیں۔ ان کا ابلاغ ہورہاہے۔ ابلاغ کے بغیر فن ایسا ہی ہے جیسے چابی کے بغیر تالا۔ تالے کو کتنا تجریدی ' علامتی ' ابہامی ' الہامی قرار کیوں نہ دیا جائے۔ اس کا کھل جانا اور بند ہوجانا اس کی سب بڑی خصوصیت ہے۔ اس تناظر میں آج کے ادب کو دیکھا جائے تو دکھائی دیتا ہے کہ چند بڑے بن جانے سے رہ جانے والے بزعم خویش بڑائی کے دعویدار فنکار تجرید علامت و ابہام کو ڈھال بناکر ابلاغ کا گلہ جان بوجھ کر گھونٹتے نظر آتے ہیں۔ تاکہ ان کے فن کی چھوٹائی ظاہر نہ ہونے پائے۔ آج اس فن کو بڑا سمجھنے کی ریت کو امداد باہمی کے

اصولوں کے مطابق پروان چڑھایا جارہا ہے جس کے مطابق بڑا فن پارہ وہ ہے جو قطعا" سمجھ میں نہ آئے۔ جس کے سمجھنے کے لئے فن کار کا ساتھ بیٹھا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ گھ سمجھ نہیں آتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کند ذھنی، کم ذوقی، ناسمجھی کے الزام سے بچنے کے لئے ہر شخص سمجھ میں نہ آنے والی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر سرہلاتا ہے۔ بلکہ بقول شخصے سر دھنتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ذہانت اور فن شناسی کی سند پاتا ہے۔ اسی لئے کہاجاتا ہے کہ آج کے دور میں ادب بانجھ ہورہا ہے۔ زمانے پر ایسے ادوار ضرور آتے ہیں جب کھوٹے سکوں کا رواج ہوجاتا ہے۔ کھوٹے سکے پھر کھوٹے راستوں سے اپنے وجود کو منواتے ہیں اس کے لئے خوشامد' رشوت اور انجمن ستائش باہمی کے زریں کلیدوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ جسے خوش فہموں نے پی آر کا نام دے رکھا ہے۔ آپ سرے سے ادب و شاعر ہوں یا نہ ہوں با ایں ہم اگر آپ جمود زدہ حاضر پاکستان میں ادب و فن کے افق پر چھاجانا چاھتے ہی• تو پی آر کا وہ جھاڑ باندھیں اپنے آپ کو خود اتنے تواتر کے ساتھ بڑا کہیں۔ کہلوائیں۔ کہ لوگ مجبورا" آپ کو بڑا مان لیں اس صورت حال کو ہمارے دوست نے ان الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے

ادیب کو اس کا لکھا ہوا ابد تک زندہ ہے نہ کہ ادبی پیری مریدی یا گٹھ جوڑ۔ اچھے ادب کو بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خوشبو کی طرح پھیل جاتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اپنی پی آر خود ہوتا ہے۔ اپنے قدر شناس خود پیدا

کرتا ہے۔ ادب میں نظریاتی گروہ بندی کے سوا ہر قسم کی گروہ بندی کمزور ادیبوں کا کام ہے۔ جو کمپنی کی مشہوری کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ اپنا پرچہ تو خیر ہوتا ہی ہے دوسرے رسالوں میں اپنے لئے گوشے محفوظ کرائے جاتے ہیں۔ ایسے نا ادیبوں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ جو طرح طرح کے پاپڑ بیلتے ہیں مضمون نگاروں اور کالم نویسوں کو پھانسنے اور خوش رکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ فوٹوگرافروں کی خوشامد کرتے ہیں۔ ضیافتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی ادیب آجائے تو دبوچ لیتے ہیں۔ مگر جس بات پر توجہ دینے کی ضروت ہوتی ہے ادھر نہیں آتے۔ یعنی وہ خود کیا ہیں۔

سیدہ حنا کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کا فن ان بدعتوں سے پاک ہے جنہیں جدتوں کے نام پر ادب کے سر تھوپا جا رہا ہے۔ ان کا فن کرسٹل کلیئر ہے صاف شفاف' پاک صاف' نفیس و شائستہ' پی آر کی آلائشوں سے پاک' یہ پی آر کی تغافل فرسائیوں کا ہی کرشمہ ہے۔ کہ جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ پتھر کی نسل چھپنے کی منزل آئی تو ادب کے سامراج لاہور کے ایک ادب نواز پبلیشر نے سیدہ حنا کے وجود سے انکار کردیا۔ جس کا سیدہ حنا کو بڑا دکھ ہوا۔ چنانچہ یہ زخم گلہ بن کر ان کے دیباچے میں کھل اٹھا ہے

"وہ کسی سیدہ حنا کو نہیں جانتا' میرا ناولٹ تنہا' اداس لڑکی" اس نے نہیں پڑھا تھا۔ اس نے ادبی دنیا افکار اوراق ' اردو زبان ' سیارہ میں بھی میرا نام اور

میرے افسانے نہیں پڑھے تھے۔ علمی رسائل میں "الرحیم" سندھ بھی اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ سلیم اختر کی کتاب "مختصر تاریخ ادب اردو" بھی اس نے نہیں پڑھی تھی۔ آئینہ اقبال اس کے مطالعے سے محروم رہا تھا۔ آج کی شاعرات میں بھی، اس کو میرا نام نہیں ملا تھا۔ اکادمی ادبیات کی اردو غزل 1976-1979 بھی اس نے نہیں دیکھی تھی، ایوان غزل اور نیا پرانا لہجہ نام کی کتابیں تو غالباً" ابھی تک اس کے پاس پہنچی ہی نہیں تھیں" مگر یہ فنکار مخلوق بھی عجیب چیز ہے۔ زخم کھا کر ملول تو ہوتی ہی ہے مگر داد کی تھپکی پا کر پھول کی طرح کھل اٹھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فنکار کے لئے اس کا سب بڑا انعام صحیح قدردانی اور فن فہمی ہے۔ سیدہ حنا کو گو پی آر کے راکٹ نے آسمان پر نہیں چڑایا۔ مگر ان کو ابتدائے فن میں ایسی راہنمائی اور قدردانی کے تحائف مل گئے۔ جنہوں نے ان کے فن کی درخشندگی کو مزید اجال دیا۔ اور زخم پھول بن کر مہک اٹھے۔ ان کے پہلے افسانے "خاکہ" کو بغیر کسی سفارش بغیر ترمیم و اضافے کے ادبی دنیا کے 1956 کے شمارے میں مولانا صلاح الدنی احمد مرحوم نے چھاپا۔ اور پہلے افسانے پر اتنی بڑی داد شائد ہی کسی لکھنے والے کو ملی ہو۔ مولانا نے افسانہ اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔

"تقسیم ملک ے بعد اردو افسانے میں جو زوال رونما ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ خود زوال پذیر ہونے کو ہے۔ دنیائے افسانہ کی شب تیرو تار کبھی کبھی کوئی شہاب ثاقب آسماں سے ٹوٹتا ہے اور فضا میں ایک غبار نور بکھیرتا ہوا افق

کے کناروں تک جا پہنچتا ہے۔ جہاں تک ادبی دنیا کا تعلق ہے۔ تقسیم کے بعد اس کی فضا میں صرف دو ایسے شہاب نمودار ہوئے۔ جاوید جعفری اور قاضی سلطان پوری، اور دونوں ایک قلیل وقفہ درخشانی کے بعد زندگی کی پنہائیوں میں گم ہوکررہ گئے۔ اور دیکھئے اب افق فن پر ایک تیسرا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ سیدہ حنا۔ خدا کرے یہ ستارہ ستارہ ہی رہے۔ شہاب بن کر آسمانی وسعتوں میں گم نہ ہوجائے۔ سیدہ حنا کا "خاکہ" اپنی ندرت تصور، فکر، اور خوبی بیان کے اعتبار سے اردو کے عظیم افسانوں میں ایک مقام امتیاز کا حق دار ہے۔ اور فن کار نے افسانے کو مکتوب کی صورت دینے میں جس ماہرانہ ضاعت کا اظہار کیا ہے۔ مشرقی ادبیات میں اس کی مثال بنگال کی نامور افسانہ نگار سیتا چڑجی کے تخلیقات کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

مردوں کی اس دنیا میں مرد عورت پر حکمرانی ہی نہیں کرتے ان کے خیالات ، جذبات اور احساسات کی ترجمانی کا ٹھیکہ بھی انہوں نے ہی لے رکھا ہے۔ یہ بات عصمت چغتائی نے نہ بھی کہی ہو تو حقیقت سے بعید نہیں۔ عورت کے دل پر گزرنے والی واردات کو مرد کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ملزم منصف بن جائے تو انصاف کا حق کیسے ادا ہوتا ہے۔ مگر اور دھاندلیوں کی طرح یہ بات بھی کھلے بندوں ہورہی ہے۔ سیدہ حنا نے عورت کے اس دکھ کی دستک کو خود بارہا سنا ہے۔ کیونکہ وہ خود ایک محسوس کرنے والی بے خوف عورت ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ دکھ کرب بن کر بولتا ہے۔ آنسو بن کر چھلکتا ہے۔ اور خون

بن کر کر رستا ہے
پتھر کی نسل کے ایک افسانے نے سوچ کی آنچ میں لکھتی ہیں

کیا پڑھنے لگیں Women 's World ہاں اچھا ہے دیکھ ڈالو۔ کیا حرج ہے۔ اور کچھ نہیں تو بالوں کے دو چار سٹائل ہی سیکھ جاو گی۔ عورت کی دنیا میں اس کے جسم کے سوا اور ہے ہی کیا۔ بال آنکھیں آبرو ہونٹ رخسار۔۔۔اور جب ان کی مانگ کم ہونے لگے۔ تو سینہ کمر پیٹرو پنڈلیاں اور۔۔۔۔ ہر طرف جسم ہی جسم بکھرے ہوئے ہیں سوکھے سڑے جسم موٹے پلپلے جسم' بدصورت جسم' دور سے مہکتے ہوئے مگر نزدیک جاو تو ابکائیاں آنے لگیں"

سیدہ حنا وہ نہ بن سکی جو جسم کے تقاضے اسے بنانا چاہتے تھے۔ اس نے جسم کی طلب کو روح کے کرب میں ڈھال کر اسے افسانے کے رگ وپے میں سرایت کردیا۔ ان کے افسانے اسی جسم و روح کی آویزش اور کشمکش کی دلفریب داستان ہے۔ مگر یہ افسانے ان کی روح کی طرح پاکیزہ ہیں۔ جن میں وہ بار بار آلائش زدہ جسم کی شکست سے ہمکنار کرکے مسرت آمیز اشکوں کی سوغات بانٹتی ہے۔ وہ بس سٹاپ پر کھڑی اس کی لڑکی کی مانند ہے جس کے ہاتھ میں کتابیں۔ دل میں ارماں' آنکھوں میں حیا' ذھن میں بلند آئیڈیل جس کے ارد گرد موٹریں آتی جاتی ہیں۔ وقفوں وقفوں سے اس کے لئے بھی موٹریں رکتی ہیں۔ دروازے کھلتے ہیں۔ مگر وہ اس آنے والی پر ھجوم بس کے انتظار میں

کھڑی ہے۔ جس میں کچلے ہوئے ارمانوں کی چتائیں انسانوں کے روپ میں پہلے ہی اس کی منتظر ہوتی ہیں۔ وہ آنسوؤں کو عینک کے پیچھے چھپائے اس ہجوم میں شامل ہو جاتی ہے۔ جو اکثریت کا نصیبہ ہے۔ اس کا محبوب اس کے پاس آ کے لوٹ جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کسر باقی رہ جاتی ہے فراق کے لمحے ختم نہیں ہوتے۔ ان کا آئیڈیل انہی کی رفتار سے ان کے آگے بھاگ رہا ہے۔ مگر وہ کسی آئیڈیل کے پیچھے بھی نہیں بھاگ رہیں۔ وہ تو زندگی کا سفر پروقار وضعداری' شائستہ قطعیت کے ساتھ طے کرتی آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کا یہ سفر ان کو اندھیروں یا کھائیوں کی طرف نہیں لے جاتا۔ کیونکہ انہوں نے جسم کا راستہ نہیں کیا۔ روح کے فراز پہ زینہ لگایا ہے

سیدہ حنا کے افسانے کی اپنی زندگی کی تفسیر تعبیر اور تقدیر آتے ہیں جس کے تانے بانے ان کے مشاھدے مطالعے اور خوابوں نے مل کر بنے ہیں۔ بیاہ' مامتا اور محبت کی آس۔ اس کی دھوپ چھاؤں میں ان کی کہانیاں زندگی کی حقیقت سے بھرپور تصویریں بناتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا ولن سماج یا سامراج نہیں۔ بلکہ ان کا اپنا آئیڈیلزم ہے۔ جو بہترین کی تلاش میں ان سے خوب اور خوب تر چھڑوا لیتا ہے۔ ان کے ہاں ایک تلاش اور سفر کا سماں ملتا ہے۔ ایک تشنگی اور پیاس کا گماں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جنس بلاشبہ ایک اہم کردار کرتی ہے مگر یہ جنس جنسی سے زیادہ جذباتی اور فکری ہے۔ انہیں اپنی اور اپنی ہم جنسوں کی مقدروں کا رونا' رونا ہے۔ ان کے اس قسم

کے افسانوں میں جنس تلذذ یا تحقیر کے لئے نہیں آتی بلکہ زندگی کے حقائق کی عریانی ہے۔ جو کبھی خوشبو بن کر مہکتی ہے تو کبھی سڑاند بن کر فکر و خیال کو تکدر سے ہمکنار کردیتی ہے۔ وہ اس محبوب کی تلاش میں ہیں جو بارہا آکر لوٹ گیا ہے۔ جسطرح رشید احمد صدیقی کی تحریر پر علی گڑھ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اسی طرح سیدہ حنا کی کہانیوں پر ان کے کالج پروفیشن کا گہرا پرنٹ ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ ذہین مگر حساس انسان کی طرح زندگی کو دکھوں کی وادی سمجھ کر اس میں اترتی ہیں۔ ان کو زندگی کی خوبیوں کا علم ہے۔ مگر وہ پھولوں اور خوشبوں کی تلاش میں فریب پہ فریب کھاتی ہیں۔ قدم قدم پر کانٹے پھولوں کی قبا پہنے ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ ہر خوش فہمی کے عقب میں ایک مکروہ فریب کا چہرہ نمودار ہوتا ہے

سیدہ حنا افسانہ نگاروں کی صف میں ایک ایسی فنکاہ کی مانند ہیں جس نے فن افسانہ کو اپنے فکر و اسلوب کی صداقت سے جلا بخشی ہے۔ ان کا اسلوب بیاں شفاف و بے باک ہے۔ ایک شائستہ ذہانت آمیز بے رحمی لئے ہوئے ۔ وہ جو بات کہنا چاھتی ہیں کہہ دیتی ہیں مگر سلیقے اور فنکارانہ بانکپن کو مجروح کئے بغیر۔ ان کی کہانیاں سچی ہیں۔ مگر انھوں نے اسے جھوٹی کہانیوں کا نام دیا ہے۔ کیونکہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے کا رواج عام ہے۔

LIST OF BOOKS OF DR. ZAHOOR AHMAD AWAN

Published

1.	"Sab Dost Hamary"	(Urdu)	Laiterary pen pictures
2.	"Dekh Kabira Roya"	(Urdu)	American Traveilogue
3.	"Turkey - History/Culture"	(Urdu)	An introduction
4.	"Nazre - Nazir"	(Urdu)	Citical Analysis
5.	"Doe Iqbal"	(Urdu)	Collection of Articles
6.	"Cashmere "INTIFADA"	(English)	Political Analysis

Un - Published

7.	"Iqbal and Shariati"	(Urdu)	A Comparative Study
8.	"Bekar Mabash"	(Urdu)	Random Articles
9.	"Iqbal and Afghanistan"	(English)	Iqbal's visit to Afghanistan
10.	"Iqbal and Afghan Personalities"	(English)	Iqbal's Aghan Connection
11.	"Mathenave Musafir of Iqbal"	(English)	Translation from Persian
12.	"Amrika Nama"	(Urdu)	Travelogue
13.	"Dil Pishori"	(Urdu)	Collection of Columns
14.	"Peshawar Nama"	(Urdu)	Collection of Columns
15.	"Roodadain"	(Urdu)	Literary reports
16.	"Makatib-e-Pakistan"	(Urdu)	Collection of letters
17.	"Masail-e-Pakistan"	(Urdu)	Collection of Articles
18.	"Adbi Mazamin"	(Urdu)	Literary Articles)

ڈاکٹر ظہور اعوان غضب کے لکھاری ہیں۔ تحریر و تسوید کے میدان میں ان کی آمد خاص دھماکہ خیز رہی۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت کے آگے متعدد متفرق موضوعات دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ تعلیم و تعلم، تنقید و تحقیق، اقبالیات، تراجم، اخباری کالم، خاکہ نگاری، سفرنامہ، تاریخ و تہذیب، غرض کوئی بھی موضوع ان کا حدف بننے سے محفوظ نہیں رہا۔ سچ پوچھیے تو ان کا قلم جس مستعدی سے فراٹے بھر رہا ہے اور جس تیزی سے وہ لکھ رہے ہیں اس تیزی سے تو بی بی سی والے خبریں نشر نہیں کر پاتے۔ یقین مانئے ان کی زود نویسی بلکہ تیز نویسی کا یہ عالم ہے کہ دیکھ کر دھڑکا لگ جاتا ہے کہ کہیں نظر نہ لگے اس کے دست بازو کو۔

پروفیسر سید اشرف بخاری

ایم اے اردو' انگریزی' پولیٹکل سائنس' ایم ایس (انٹرنیشنل ریلیشنز (امریکہ) پی ایچ ڈی سنٹرل ایشین سٹڈیز' یونائیٹڈ نیشنز انٹرن شپ (نیویارک) سکریٹری جنرل تھرڈ ورلڈ ایجوکیشن فورم اور ادارہ علم و فن' ممبر APSA (امریکہ) ممبر UN رائٹرز ایسوسی ایشن (نیویارک) یہ ہیں ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جن کی زندگی علم' ادب اور تحریر تقریر سے عبارت ہے۔

لکھنا پڑھنا اور چوکھی لڑنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اتنا زود رنج اور زود نویس آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔ لکھ لکھ کر کشتوں کے پشتے لگادیئے ہیں۔ ادب' علم' صحافت' سیاست' کالم نویسی' خاکہ نگاری' سفرنامہ نگاری' بین الاقوامی امور' اقبالیات غرض کسی موضوع کو انہوں [illegible] نہ چھوڑا نہیں ہے۔ اردو انگریزی دونوں میں رواں ہیں۔ لگتا ہے امریکہ سے کتابیں لکھنے کا کوئی کورس کر [illegible] ئے ہیں۔ قلم میں غضب کی کاٹ ہے۔ ذو معنی جملے لکھنے کے ماہر ہیں۔ تحریر میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ عل [illegible] ساتھ ادبیت مل کر ان کے اسلوب کو مزید نکھار دیتی ہے۔ استاد' صحافی' دانشور' ادیب پتہ نہیں کیا کچھ ہیں [illegible] ہی عرصے میں انہوں نے مضامین نو کے انبار لگادیئے ہیں۔

ان کے ادبی خاکوں کی کتاب "سب دوست ہمارے کو اباسین ادبی ایوارڈ اور گولڈ میڈل بھی ملا ہے۔ دو اقبال' نذر نظیر خسرو' غالب و فیض کے نام سے ادبی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ دو سفرنامے دیکھ کبیر رویا اور امریکہ نامہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ترکی ادب و ثقافت پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ کالموں کے دو مجموعے نقشہ کالم اور بیکار مباش' سیاسی و سماجی مضامین کا مجموعہ دو پاکستان' ادبی کتابیں اقبال و علی شریعتی' اقبال و افغانستان' اقبال و افغان شخصیات' اقبال و افغان شناسی اور اقبال و ادب سرحد کے عنوانات سے تکمیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ ایک انگریزی کتاب کشمیر انتفادہ بھی چھپ چکی ہے۔ صاحب طرز ادیب ڈاکٹر ظہور اعوان صوبہ سرحد کی نثری ادب کی ایک پہچان بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر میں خود موجود ہوتے ہیں۔

کرنل عنایت اللہ خان
صدر ادارہ علم و فن پاکستان